BUDC-134

اردو نظم کا مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینیٹیز

بلاک

2

چنندہ نظم گو شعرا کی نظم گوئی کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریحات-I

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 5
نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 69

اکائی 6
محمد حسین آزاد کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 87

اکائی 7
مولانا الطاف حسین حالی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 101

اکائی 8
اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 131

بلاک 2 تعارف

کورس **BUDC-134 اردو نظم کا مطالعہ** کے دوسرے بلاک کا عنوان **چنندہ نظم گو شعرا کی نظم گوئی کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریحات-I** ہے۔ یہ بلاک منتخب نظم نگاروں کی خصوصیات اور ان کی مخصوص نظموں کی تشریحات سے متعلق ہے۔اس میں کل 4 اکائیاں ہیں۔

اکائی5: نظیر اکبرآبادی کی حیات، فن اور نظم نگاری کی خصوصیات کے ساتھ ان کی دو منتخب نظموں کی تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

اکائی6: محمد حسین آزاد کی نظم نگاری، ان کے عہد، فن اور منتخب دو نظموں کی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔

اکائی7: خواجہ الطاف حسین حالی کی نظم نگاری. اور منتخب نظموں کی تشریحات میں حالی کے حیات، فن اور دو منتخب نظموں کی تشریحات ہیں۔

اکائی8: اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری کا پس منظر، عہد اور فن کے ساتھ دو منتخب نظموں کی تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

اکائی 5 نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

5.3.1 سوانحی خاکہ

5.3.2 نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی خصوصیات

5.3.3 نظم ''مُفلسی'' کا متن اور اس کی تشریح

5.3.4 نظم ''آدمی نامہ'' کا متن اور اس کی تشریح

5.4 آپ نے کیا سیکھا

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

5.6 سوالات کے جوابات

5.7 فرہنگ

5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- نظیر اکبرآبادی کا سوانحی خاکہ اور ان کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات کے بارے میں واقفیت حاصل کریں گے
- نظیر آکبرآبادی کے عہد کا ادبی پس منظر اور ان کی شاعری کے موضوعات کا مطالعہ کریں گے
- نظیر اکبرآبادی کے اسلوب کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے
- نظیر اکبرآبادی بحیثیت نظم گو شاعر سے متعارف ہوں گے
- نظیر اکبرآبادی کی نظموں ''مُفلسی'' اور ''آدمی نامہ'' کے جملہ پہلوؤں کی تشریح و تجزیہ کا مطالعہ کریں گے

5.2 تمہید

نظیر اکبرآبادی کی صدی یعنی اٹھارہویں صدی کو اردو غزل کی صدی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مگر ایسا نہیں کہ اس عہد میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، واسوخت اور رباعی وغیرہ نہیں لکھی گئیں۔ ساری اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی جارہی تھی مگر اس صدی کی سب سے اہم بات اردو نظم کا ارتقا ہے جو نظیر اکبرآبادی سے منسوب ہے۔ اس دور میں غزل میں جو مقام میر تقی میر، قصیدے میں محمد رفیع سودا اور متصوفانہ شاعری میں میر درد کو حاصل ہے نظموں میں وہی مقام نظیر کا ہے۔ نظیر اکبرآبادی عوامی شاعر تھے۔ انھوں نے عوامی موضوعات پر اردو کے عوامی لہجہ میں بڑی خوبصورت شاعری کی ہے۔ انھیں زمین سے جڑا ہوا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کے موضوعات روزمرّہ کی زندگی سے، میلوں ٹھیلوں سے، تیوہاروں، موسموں سے، تماشوں اور رسم ورواجوں سے لیے گئے ہیں۔

اس عہد کے ادبی پس منظر میں ولی دکنی کے بڑھتے ہوئے اثرات، زبان اردو اور ریختہ کو مستحکم کرنے میں فائز، آبرو، ناجی، حاتم، مضمون، فغاں وغیرہ کی کوششوں اور سب سے اہم سودا، درد، سوز اور میر تقی میر کی مقبولیت اور شہرت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ شعرا نے نہ صرف اردو کو مقبول بنایا اور ریختہ کو مستحکم کیا بلکہ ولی دکنی کے تتبع میں ہی صحیح اردو زبان وادب میں ہندوستانی اور مقامی عناصر کی شمولیت کے لیے دروازے وا کیے۔ تاہم موضوعات کا دائرہ کم وبیش پہلے ہی جیسا تھا یعنی ایسے موضوعات کو فوقیت حاصل تھی جن کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہو۔ لیکن نظیر نے اپنے معاصرین سے بالکل مختلف ایک نئی راہ نکالی جو عوامی روایت سے جڑی تھی۔ اس لیے انھیں ایک طویل عرصے تک وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ نواب شیفتہ نے اپنے تذکرے 'گلشن بے خار' میں نظیر اکبرآبادی کو شعرا کی صف میں نہیں شمار کیا۔ اس کے جواب میں نظیر کے شاگردوں نے کئی تذکرے مرتب کیے۔ ان میں ''گلستان بے خزاں'' سب سے مشہور ہے۔ باطن نے ان کی مدح سرائی میں ساری حدیں پار کرڈالیں۔ نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے موضوعات یہ ہیں:

میلے ٹھیلے (مہادیو جی کا میلہ، حضرت سلیم چشتی کا عرس، تیرا کی وغیرہ) مذہبی تیوہار (عید، شب برات، ہولی، دیوالی، راکھی وغیرہ)، قدرتی واقعات وحالات (آندھی، برسات، بھونچال وغیرہ)، مشاغل (گھڑی، چاندنی رات وغیرہ)، غیر فانی موضوعات (محبت وعشق، زندگی، عمر، موت، پیدائش وغیرہ) اور معاشرتی عدم مساوات (بنجارہ نامہ، فنانامہ، آدمی نامہ وغیرہ)

5.3 نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

5.3.1 سوانحی خاکہ

سید محمد ولی تخلص نظیر اکبرآبادی، نادرشاہ کے حملے سے چند برس قبل 1735 کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا جن کی شادی آگرہ کے قلعہ دار کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔

محمد فاروق کا نام بھی عظیم آباد کے کسی نواب کی فہرست مشاہیر میں شامل تھا ان کی بارہ اولادیں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ بڑی ہی منتوں کے بعد تیرہویں اولاد یعنی نظیر اکبر آبادی زندہ رہ سکے۔ اس لیے نظر بد سے بچانے کے لیے ان کے ناک اور کان چھید کر بلاق اور دُر پہنا دیے گئے تھے۔

دہلی پر ہو رہے پے در پے حملوں کی وجہ سے نظیر بیس بائیس کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ساتھ آگرہ منتقل ہو گئے اور آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ایک روایت کے مطابق آگرہ ان کو اتنا عزیز تھا کہ راجہ بھرت پور نے انہیں بلایا لیکن انھوں نے آگرہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ نظیر طبیعتاً درویش صفت تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اتالیقی اور معلّمی سے ملنے والے مشاہرہ پر گزار دی۔ اور تقریباً 98 سال کی عمر میں 1830 کو آگرہ میں ہی وفات پائی۔ آگرہ میں ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنیوں اور اثنا عشریوں نے الگ الگ اپنے طور طریقوں سے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ کفن کے اوپر والی چادر کو غیر مسلم اہلِ وطن لے گئے اور اپنے مذہب کے مطابق آخری رسومات ادا کی۔ آج بھی ان کے مقبرے پر سالانہ عرس منعقد ہوتا ہے۔ نیز موسیقی کاروں، مجذوبوں اور عوام کی زبردست بھیڑ اکٹھا ہوتی ہے۔

نظیر نے محمد شاہ کے اس دور حکومت میں آنکھیں کھولیں جو اپنے انتشار اور بدامنی کے لیے مشہور ہے۔ آئے دن دلی پر نت نئے حملے ہو رہے تھے یا پھر برسر اقتدار بادشاہ کو معزول کر دیا جاتا تھا۔ مجموعی طور پر یہی بے چینی، سیاسی عدم استحکام، ایرانی و ترکی اور مقامی لوگوں کے درمیان سر ابھارتے ہوئے جھگڑے، معاشرتی زندگی میں عوام کی آزادی اور اقتصادی زبوں حالی ایسے عوامل تھے جن کی وجہ سے مغلیہ سلطنت بڑی ہی سرعت سے روبزوال تھی۔ دوسری جانب ایرانی اور ترکی تہذیبوں اور زبانوں کی گرفت بتدریج کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ گرچہ اب بھی فارسی زبان کا دور دورہ تھا تاہم مقامی زبانوں اور فارسی کی آمیزش سے بننے والی نئی زبان بڑی تیزی سے پھل پھول رہی تھی۔ ساتھ ہی مسلسل شورشوں اور عوام کی آزادہ روی کی وجہ سے مقامی تہذیبوں اور تصوف کے پھلنے اور پھولنے کی راہ بھی ہموار ہو رہی تھی۔

نظیر نے مروجہ تمام اصناف سخن مثلاً غزل، رباعی، مثنوی، قصیدہ، نعت الغرض تمام تر مروجہ صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن ان کی مقبولیت کا راز ان کی نظم نگاری میں مضمر ہے۔ مذکورہ مروجہ اصناف سخن کی بنیاد پر ہی ایک طویل عرصے تک انھیں دوسرے درجے کا شاعر قرار دیا گیا۔ لیکن ان کی نظمیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو ایجاد کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں کی سب سے متاثر کن بات یہ ہے کہ پہلی بار اردو شاعری میں اس عہد کا معاشرہ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اور معاشرے کا ہر طبقہ بالخصوص غریب کسان اور جوگی وغیرہ اپنی تمام تر معصومیت اور اپنی شان بان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی نظموں میں نظیر کے عہد کا آگرہ اپنے موسم، معاشرہ، تہواروں، میلوں، مشاغل، اور اجتماعی نفاست کے ساتھ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی اصل شناخت یہ ہے کہ وہ عوام کی نظر سے ہر شئے کو پرکھتے ہیں اور ہر موقعے و لمحے اور مسرت کے رس کو کشید کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ مطالعۂ نظیر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان آگرہ کی عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے جس میں کہیں کہیں کھڑی بولی اور برج بھاشا کی آمیزش کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک آدھ نظموں میں عربی اور فارسی کے علاوہ اودھی اور پنجابی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے نظیر کی زبان قدیم اردو سے کافی مشابہ ہے، مثلاً ذری (بمعنی ذرا) دکھلا (بمعنی چلمن)، دوالیں (بمعنی دیواریں)، کرکر (بمعنی کرکے) وغیرہ کا استعمال جگہ جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ جب کہ نظیر اکبر آبادی سے قبل درد، سودا اور میر کافی نکھری ہوئی زبان استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسی زبان کے استعمال کا ایک جواز بقول خلیل الرحمٰن اعظمی یہ ہے کہ ''نظیر بھدے پن کی حد تک عوام کے ساتھ تھے''۔ دراصل اس وقت آگرہ کی گلیوں میں جو زبان استعمال ہو رہی تھی اسی زبان کو نظیر نے بھی برتا بطور خاص دیوالی، ہولی جیسے موضوعات پر نظمیں کہتے ہوئے انہوں نے ہندوؤں کی اصطلاحات کو استعمال کیا اور خوانچے و پھیری والوں پر قلم اٹھاتے ہوئے آگرہ کے نچلے طبقے کی زبان کو استعمال کیا۔ اسی سبب سے ان کی نظموں میں شعری نقائص کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فنی اور تخیلاتی ناہمواریاں بھی کھٹکتی ہیں۔ مگر بقول پروفیسر احتشام حسین: ''ان کی صداقت اور انسانیت دوستی سب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور نظمیں پڑھتے ہوئے بند اور رندھے ماحول سے نکل کر ہم کھلی ہوا میں آجاتے ہیں''۔

بطور مجموعی نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے موضوعات اور زبان پر یہ جملہ صادق آتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی موضوعاتی اور لسانی دونوں اعتبار سے عوامی اور خالص ہندوستانی شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری بھی ہندوستانی موسیقی کے لئے اور آہنگ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

5.3.2 نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی خصوصیات

نظیر اکبر آبادی بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل اور دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں شہرت نظموں کی وجہ سے ہی ملی۔ میر، سودا، میر حسن، جرات وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعران کے ہم عصر تھے۔ یہ دور اردو غزل کا عہد زریں تھا۔ لیکن نظیر نے نظم نگاری کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا اور اپنے مخصوص اسلوب اور عوامی لب و لہجے سے اردو نظم کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انھوں نے اردو شاعری کو خیالی دنیا سے باہر نکال کر انسان کی حقیقی زندگی سے اس کا رشتہ جوڑا۔

شعر و ادب کی تخلیق کے محرّکات انسانی زندگی اور سماج و معاشرے میں رونما ہونے والے مختلف حالات و واقعات ہوتے ہیں اور ادیب یا شاعر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے اپنی تخلیقات کا حصّہ بناتا ہے۔ اس لحاظ سے نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے لیے سارا مواد اپنے گرد و پیش کے سماج اور معاشرے سے اخذ کیا اور انھیں پوری

سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے عہد میں مروّجہ شعری روایات کے برعکس عوامی معاملات و مسائل کو اپنے تخیل، تجربے، مشاہدے اور انسان دوستی کے جذبے سے معمور ہوکر اپنی شاعری میں جگہ دی۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

''نظیر کا کلام اپنے وقت اور اپنے ماحول کا آئینہ ہے۔ واقعات و حالات اور رسوم و روایات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں نظیر نے ہم کو دی ہیں وہ اردو شاعری کے حصّے کی چیز نہ تھیں۔''

انسانی زندگی اور معاشرے کی حقیقتوں اور حالات و مسائل کو نظیر نے اپنے تجربے و مشاہدے اور تخیل کی بلند پروازی سے اپنی نظموں میں فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیت، زور بیان اور قادر الکلامی کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات اور مشاہدات کی ترجمانی اتنے خوبصورت پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے اس کی پوری تصویر گھوم جاتی ہے۔ سادگی اور برجستگی ان کے کلام کو پُر اثر بناتی ہیں۔ ہولی، دیوالی، آگرہ کی تیراکی، مفلسی، تندرستی، برسات کی بہاریں، آندھی، بھونچال، ریچھ کا بچہ، چاندنی رات وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو مرقع نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

نظیر کا تجربہ و مشاہدہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو خواہ اس کا تعلق مذہب، سیاست، سماج، معیشت، تہذیب و تمدن، کھیل کود، سیر و تفریح وغیرہ کسی سے بھی ہو ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔ وہ انسانی زندگی کے ہر گوشے اور پہلو کو فنی چابکدستی اور ہنرمندی سے موضوع سخن بناتے ہیں۔ بقول سید مجاور حسین:

''نظیر ہندوستان کی ادبی تاریخ کے واحد عوامی شاعر ہیں جنھوں نے دور حاضر کی عوامی شاعری کے لیے راہیں اور سمتیں متعین کیں اور جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں مشترکہ کلچر، قومی یک جہتی کے تصورات اور اس کی زرعی معاشرت و تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی جو تقریباً پانچ ہزار سال کی تاریخ کی وارث تھی۔''

نظیر اکبرآبادی کا عہد اور ماحول سماجی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ آگرہ عہد اکبر میں سماجی و سیاسی اعتبار سے ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ اس سرزمین پر بھگتی تحریک کی امن و آشتی، بھائی چارگی، انسان دوستی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تعلیم چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نظیر نے اس ماحول و معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور ایک حساس شاعر کی حیثیت سے انسانی زندگی کی رنگارنگ کیفیات کو اپنے تجربے و مشاہدے سے اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں آگرہ بھی ناسازگار حالات کا شکار ہوا۔ سماجی اور معاشی اعتبار سے وہاں کے عوام کو پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتحال کو نظیر نے اپنی ایک مشہور نظم ''شہر آشوب'' میں نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ نظم نظیر کے واضح سماجی شعور اور انسان

دوستی و دردمندی کی عمدہ مثال ہے۔

نظیر کی شاعری حقائق پر مبنی ہے اور وہ زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان اور انسانیت کے پجاری ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حرص و ہوس، مفاد پرستی اور خودغرضی انسانیت کی دشمن ہے۔ طبقاتی سماج کی کشمکش، فرسودہ روایات اور رسم و رواج کے برعکس انھوں نے انسانی زندگی میں معاشرتی حسن سلوک اور بھائی چارگی پر زور دیا۔ ان کے کلام میں مذہبی رواداری، معاشرتی حسنِ سلوک اور انسان دوستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

وہ انسان کو مذہب و ملّت یا رنگ و نسل کے نام پر نہیں بلکہ اسے صرف انسان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ نظیر اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اور اپنی عملی زندگی میں اعلیٰ انسانی قدروں کی پرزور حمایت کی ہے۔ سیکولر طرز عمل کی عمدہ مثالیں ان کی شاعری میں جا بجا موجود ہیں۔ مذہب و ملّت اور ذات پات کی تفریق سے الگ نظیر نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے: ؎

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں — جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن
زنار گلے میں یا کہ بغل بیچ ہو قرآن — عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلمان
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا — آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا

نظیر مذہب و ملّت، ذات پات، حرص و ہوس، خودغرضی، مفاد پرستی کے سبب انسانی کشمکش، محرومی اور اداسی سے خوب واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں صبر و قناعت دردمندی، رواداری، آپسی ہم آہنگی بے ثبات زندگی کے لیے نہایت سودمند ہے۔ نظیر کے بقول:

افلاس میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

نظیر نے زندگی کی بے ثباتی اور اس میں انسان کی محرومیوں، اداسیوں اور الجھنوں کو عوامی لب و لہجہ میں یوں پیش کیا ہے:

جو تو کہتا ہے اے غافل، یہ میرا ہے یہ تیرا ہے — یہ جس کا ہے، اسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو یوں سوچ دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے — نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے — مسافر بے وطن ہے یا تیرا اس جا پہ ڈیرا ہے
جو ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرالے — تو اس کے بعد پھر کہیو! یہ میرا ہے کہ تیرا ہے
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک — تجھے او بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

درجہ بالا اشعار زندگی کے تئیں نظیر کے مثبت افکار و خیالات کا بین ثبوت ہیں۔ بے ثبات زندگی کی اہمیت اگر انسان سمجھ لے تو وہ اپنی محرومیوں اور اداسیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے کیوں کہ بقول نظیر:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے موضوعات عوامی زندگی اور انسان کے حالات و واقعات سے وابستہ ہیں اس لیے انھوں نے عوامی زبان اور عام لب ولہجہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ بنجارہ نامہ، آدمی نامہ، مفلسی، روٹیاں، تندرستی، عاشق نامہ، چڑیوں کی تسبیح، کلجگ، عید، دیوالی، ہولی، شب برات، جنم کنہیا جی، تاج گنج کا روضہ، عشق اللہ، حضرت سلیم چشتی، حضرت گرو گنج بخش، کورا برتن، روٹی نامہ، ریچھ کا بچہ، جوگن نامہ، راکھی، بلدیو جی کا میلہ، برسات کی بہاریں، جھونپڑا، آٹے دال کا بیان وغیرہ جیسی نظمیں نظیر اکبرآبادی کی عوامی مسائل سے دلچسپی کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے بنیادی حقائق کی نہ صرف نشاندہی کرتی ہے بلکہ تمام جزئیات کے ساتھ ان کی حقیقی عکاس بھی ہے۔ ان کے کلام میں زندگی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ نظیر اکبرآبادی اپنے شاعرانہ کمالات کی بدولت بلاشبہ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

5.3.3 مفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں یاں عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اُسے سنبھال مفلس میں ہوویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آکے ملاتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر جس طرح کتّے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

کرتا نہیں حیا سے جو کوئی وہ کام آہ مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ
وہ سب حیا و شرم اٹھاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور وغل مچائے مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مرجاوے گر کوئی تو کہاں سے اُسے اٹھائے اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مُردے کو بے کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

چولہا توانا پانی کے مٹکے میں آبی ہے پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے مفلس کی جو روسچ ہے کہ یاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل کوئی گدھا کہے اسے ٹھہراوے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنے کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو چوری پہ آ کے ڈالے ہی مفلس کے دھیان کو
آخر، ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یار تا فقیر خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

تشریح

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے فطری موضوعات کے علاوہ سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔ ایسی ہی نظموں میں نظیر کی نظم ''مفلسی'' کا شمار ہوتا ہے۔ یہ نظم نظیر کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اس نظم کو انہوں نے پانچ مصرعوں کے بند یعنی مخمس میں تحریر کیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں سماجیاتی مطالعہ کے ساتھ نظیر نے ان حقائق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے مفلسی اور بدحالی کے پھیلنے کا امکان رہتا ہے۔ 19 بند پر مشتمل نظم ''مفلسی'' بنیادی طور پر وضاحتی انداز کی نظم ہے۔ اس نظم میں نظیر نے اپنے مشاہدے کی گہرائی اور تشبیہ و تلمیح کے استعمال اور محاورے کی گرمی سے ایسا ماحول تیار کر دیا ہے کہ یہ نظم مفلسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

نظم کے پہلے بند میں نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ جب آدمی پر مفلسی کا حملہ ہوتا ہے تو وہ مختلف طریقوں سے انسان کو پریشان کرتی ہے۔ کبھی وہ رات بھر بھوکا سلاتی ہے اور کبھی پیاسا رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس پر بھی مفلسی آتی ہے اُسے ہر قسم کے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ حکیم جو مختلف بیماریوں کا علاج کرتا ہے اور جس کی عزت بڑے بڑے نواب اور پٹھان بھی کرتے ہیں لیکن وہ بھی غریب ہو جائے تو اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ حد یہ ہے کہ لقمان سے بڑا طبیب اور عیسیٰ جیسا مسیحا بھی موجود ہو لیکن وہ غریب ہو تو اس کی تمام تر حکمت غریبی میں ڈوب جاتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے نظم کے تیسرے بند میں بتایا ہے کہ اہل علم و فضل بھی ہوں اور ان کو مفلسی گھیر لے تو وہ غریبی کی وجہ سے کلمہ تک بھول جانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بھوکے سے کوئی الف کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے ب بتاتا ہے۔ غریب کے بچوں کو پڑھانے والا سدا مفلس ہی رہتا ہے اور اگر غریب کے گھر مفلسی آ جائے تو وہ عمر بھر جا نہیں سکتی۔ اگر مفلس کسی مجلس کے درمیان اپنا حال بیان کرتا ہے تو لوگ یہی تصور کرتے ہیں کہ اس نے روزگار حاصل کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہے۔ غریب کے پاس لاکھوں علم و کمال ہوں لیکن وہ مفلس ہو تو ہزار سنبھالا لینے کے باوجود اس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ اس طرح مفلسی انسان کی تمام صلاحیتوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

نظم کے پانچویں بند میں نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ جب انسان مفلس ہو جاتا ہے تو اسے اپنی عزت سے زیادہ روٹی یا نان پیاری ہوتی ہے اور وہ ایک ایک روٹی پر جان دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی روٹی اور کھانے کا خوان دیکھتا ہے اس پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس طرح مفلسی نہ صرف روٹی کے لیے جھگڑا کراتی ہے بلکہ حد درجہ ذلیل و رسوا بھی کراتی ہے۔ مفلسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیا کی بنیاد پر جن کاموں سے انسان خود کو بچائے رکھتا ہے وہ سب کام کرنے پر وہ مجبور ہو جاتا ہے اور اس میں حلال و حرام کی بھی تمیز باقی نہیں رہتی۔ غرض جسے شرم و حیا کہتے ہیں مفلسی کی وجہ سے وہ انسان سے رخصت ہو جاتی ہے۔

ساتویں بند میں نظیر اکبرآبادی نے بتایا ہے کہ اگر انسان پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں اور وہ شور وغل مچائے تو لوگ گوارا کر لیتے ہیں لیکن مفلس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ غم کے بغیر ہی ہائے ہائے کرتا ہے اور اس کے واویلا مچانے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مفلسی کی وجہ سے اس میں اس قدر ذلت آجاتی ہے کہ اگر کوئی مر جائے تو لاش اٹھانے کے لیے اس کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ لاش کو بے کفن دفن کرنا پڑتا ہے۔ مفلسی کی وجہ سے نہ تو چولہے پر توا رکھا جاسکتا ہے اور نہ مٹکے میں پانی بھرا جاسکتا ہے۔ مفلسی کھانے پینے اور اس کے لیے رکابی حاصل کرنے کو بھی محتاج کر دیتی ہے جس کی وجہ سے مفلس بے غیرت بن جاتا ہے اور غریب کی بیوی کی عزت بھی ہر ایک کے دل سے ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اگر مفلسی اسے گھیر لے تو اس کے طفیل انسان کی قابلیت گھٹ جاتی ہے اور اسے لوگ گدھے اور بیل کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ وہ افلاس کے مارے پھٹے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ جسم، منہ اور بدن کی پاکی پہ توجہ نہیں دے سکتا۔ افلاس کی وجہ سے انسان کی شکل قیدیوں جیسی ہو جاتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی مفلسی کا اثر یہ بتاتے ہیں کہ جب کسی پر مفلسی آتی ہے تو اس کی وجہ سے دوستوں میں عزّت گھٹ جاتی ہے اور چاہنے والوں کی محبت میں کمی آتی ہے، اپنے اور غیر میں فرق بڑھاتی ہے اور اسی کے ساتھ شرم وحیا کے علاوہ عزت اور حرمت میں بھی مفلسی کی وجہ سے کمی آتی ہے۔ بہرحال انسان پر مفلسی آجائے تو اس کی بدولت جسم کی صفائی نہ ہونے سے بال اور ناخن بڑھ جاتے ہیں اور انسان صاف ستھرا رہنے کی صفت کھو دیتا ہے۔

اگلے بند میں نظیر اکبرآبادی بتاتے ہیں کہ مفلسی کی وجہ سے شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی عزت باقی نہیں رہتی، عزت کے خاتمے کے ساتھ، تعظیم اور تواضع ختم ہو جاتی ہے اور انسان اس قدر ذلیل ہو جاتا ہے کہ اسے محفلوں میں جوتوں کے قریب بیٹھنا پڑتا ہے۔ غرض مفلسی ایک ایسی حقیقت ہے جو غیر کو خاک میں ملانے، محنت کا خاتمہ کرنے اور انسان کو چوری کی طرف راغب کرنے کا کام انجام دیتی ہے اور اسی مفلسی کی وجہ سے انسان بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظم کے آخری بند میں نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں کہ دنیا میں خدا کسی بادشاہ یا فقیر کو کبھی مفلسی میں گرفتار نہ کرے۔ کیونکہ مفلسی ہی شریف انسان کو حقیر بناتی ہے۔ اس کی خرابیاں کہاں تک بیان کی جائیں بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ خدا ہر انسان کو مفلسی سے محفوظ رکھے کیوں کہ مفلسی انسان کے دل کو جلاتی ہے۔ نظیر اپنی اس نظم کو دعائیہ کلمات پر ختم کرتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کی نظم مفلسی میں بے شمار محاورے، تشبیہات اور استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی نظم میں تلمیحات کی بھی کمی نہیں۔ وہ حضرت لقمان اور حضرت عیسیٰ کا تلمیحی اشارہ اپنی نظم میں استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے نئے لفظیات کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ روزمرّہ کے استعمال کی چیزوں کو بھی اس نظم میں جگہ دی ہے۔ ان کی تشبیہات اور استعاروں سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی مفلسی کو ایک جرم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ انسان کو مفلسی کے دلدل سے نکالنا چاہتے ہیں۔

کیونکہ مفلسی کی وجہ سے شرافت اور عزت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

5.3.4 II آدمی نامہ

دُنیا میں بادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی اور مُفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار و بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو چبا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زُور
اور ہادی، رہنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں، میاں! بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن، اور نمازیاں اور آدمی ہی، اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
بیٹھے ہیں آدمی ہی دُکانیں لگا لگا کہتا ہے کوئی، لو! کوئی کہتا ہے، لا رے لا!
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا کس کس طرح سے بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اِک آدمی ہیں، جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے جن کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے، تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں کمخواب، تاش، شال، دو شالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت اور حقیر
یاں آدمی مُرید ہے اور آدمی ہی پیر اچّھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر!
اور سب میں جو بُرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' پانچ مصرعوں کی مخمس ترکیب بند ہے۔ اس نظم میں شاعر نے سماج اور معاشرے میں انسان کے مختلف مراتب اور پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔

پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں چاہے بادشاہ ہو یا مفلس، دولت مند ہو یا فقیر وہ آدمی جسے آرام کے ساتھ کھانا میسر ہے اور وہ آدمی جو بھیک مانگ کر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے سب انسان ہیں۔

دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کے لیے آگ کی طرح مصیبت اور پریشانی کا سبب بھی ہے تو وہی محبت کی طرح راحت اور روشنی کا ذریعہ بھی۔ دنیا میں آدمی کی تمام خوبصورتی اور بدصورتی، اچھائی اور برائی اجاگر ہوتی ہے اور آدمی ہی کو شیطانی حرکات میں مہارت حاصل ہے یعنی وہ مکر وفریب سے کام لیتا ہے تو دوسری طرف وہی صحیح راستہ دکھانے کا کام بھی کرتا ہے۔

تیسرے بند میں اس بات کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے کہ دنیا میں اللہ کی عبادت کے لیے مسجد بھی انسان ہی بناتے ہیں اور وہی نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور اللہ کا ذکر واذکار اپنے خطبے میں کرتے ہیں۔ آدمی ہی قرآن ونماز پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور وہ بھی آدم ہی کی اولاد ہیں جو مسجدوں سے جوتے چپل چراتے ہیں اور وہ بھی آدمی ہی ہے جو ان کی حرکتوں کو بھانپ لیتا ہے۔

چوتھے بند میں یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا میں آدمی ہی آدمی کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کرتا اور یہی انسان دوسرے انسان کا دشمن بن کر اس کا سر تلوار سے کاٹ دیتا ہے۔ یہاں انسان ہی انسان کی بے عزتی اور بے حرمتی کرتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی میں آدمی، آدمی ہی کو آواز دیتا ہے اور اس کی آواز سُن کر اس کی مدد کے لیے آدمی ہی دوڑ کر آتا ہے۔

پانچویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں مختلف دکانیں آدمیوں نے لگا رکھی ہیں جہاں آدمی ہی سامان خریدتے ہیں۔ یہاں کوئی سامان بیچنے کے لیے محبت سے پیش آتا ہے تو کوئی بے رخی سے سامان خریدتا ہے۔ یہاں آدمی ہی سر پر ٹوکرے میں سامان اُٹھا کر اسے بیچنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور وہ مختلف قسم کی چیزیں بنا بنا کر بیچتے ہیں اور انھیں خریدنے والے بھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔

چھٹے بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہاں کچھ ایسے انسان ہیں جن کی شان وشوکت نرالی ہے۔ ان کے پاس دھن اور دولت کی بھرمار ہے اور عیش وآرام کی ہر چیز انھیں میسر ہے اور اس دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر پریشانیوں اور مصیبتوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

ساتویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں شریف، کمینے، بادشاہ، وزیر، عزّت دار لوگ، حقیر اور فقیر، مرید اور پیر سب آدم ہی کی اولاد ہیں۔ دنیا میں آدمی ہی سب سے اچھا ہے اور سب سے برا بھی آدمی ہی ہے۔ شاعر نے آخری بند کے چوتھے مصرعے میں اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

تجزیہ:

'آدمی نامہ' نظیر اکبرآبادی کی ایک مشہور نظم ہے۔ نظیر اکبرآبادی انسانی زندگی کے حالات ومسائل

سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کا کلام سماجی و معاشرتی حالات کی حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بقول احتشام حسین:

''نظیر پہلا شاعر ہے جو زمین پر کھڑا معلوم ہوتا ہے۔''

نظم 'آدمی نامہ' میں نظیر نے سماج اور معاشرے میں انسانی زندگی کے مختلف روپ، سماجی حیثیت اور مرتبے کو فلسفیانہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ وہ اس عظیم کائنات میں ہر انسان کو اہم جانتے ہیں لیکن طبقاتی سماج میں آدمی کی سماجی حیثیت اور مرتبے کے امتیازات کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ نظم انسان کی سماجی حیثیت اور اس کے مختلف روپ اور نفسیات کو اجاگر کرتی ہے جس کے ذریعے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ ہو یا رعایا، دولت مند ہو یا فقیر، حسن اخلاق سے پیش آنے والا ہو یا مکار و فریبی، صحیح راستہ دکھانے والا ہو یا غلط راہ بتانے والا، سب آدمی کے ہی مختلف روپ ہیں۔

دنیا میں آدمی ہی مسجد بناتا ہے، وہی نماز پڑھتا اور پڑھاتا ہے، خطبہ دیتا اور سنتا ہے اور آدمی ہی چوری بھی کرتا ہے۔ یہاں آدمی ہی آدمی کی خاطر اپنی جان قربان کرتا ہے اور وہی کسی آدمی کی جان بھی لیتا ہے۔ آدمی ہی آدمی کی بے عزّتی کرتا ہے اور وہی مصیبت کے وقت اس کے کام آتا ہے۔ دنیا میں شان و شوکت کے ساتھ زندگی گزارنے والا اور مفلسی میں زندگی بسر کرنے والا، شریف اور کمینہ، مالک اور غلام، بادشاہ اور وزیر، مرید اور پیر سب آدمی ہی کے مختلف روپ ہیں۔ دنیا میں جو سب سے اچھا اور سب سے بُرا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے۔

غرض کہ اس نظم میں نظیر اکبر آبادی نے انسانی زندگی کی رنگا رنگی کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار آدمی کے ہی دم سے چل رہا ہے اور یہاں رونق بھی آدمی ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ نظم محض ایک مخصوص دور کے انسانی سماج کی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ اس نظم کا کینوس وسیع ہے اور یہ ہر دور کے انسانی سماج کے لیے آفاقیت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم نظیر کی صداقت، رواداری اور انسان دوستی کا واضح ثبوت ہے۔ نظم 'آدمی نامہ' کے مطالعے سے نظیر اکبر آبادی کے فکر و فن کی انفرادیت، تجربے اور مشاہدے کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فنی مہارت کے ساتھ انسانی سماج کے تضاد کو پیش کیا ہے جو قاری کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور سماج میں معاشرتی حسن سلوک کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ نظم اپنے عام فہم انداز بیان اور معنویت کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا

- نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی کی جانکاری ہوئی۔
- نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی خصوصیات سے واقف ہوئے۔

- نظیر اکبر آبادی کے اسلوب کو سمجھا۔
- نظیر اکبر آبادی کے عہد کے سماجی و ادبی پس منظر پر نظر ڈالی۔
- نظیر اکبر آبادی کی نظموں 'مفلسی' اور 'آدمی نامہ' کے جملہ پہلوؤں کو سمجھا۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ نظیر اکبر آبادی کے عہد اور ہم عصروں کی نشاندہی کیجیے؟

2۔ نظیر اکبر آبادی کے اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے؟

3۔ نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

4۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں کس صنف کو ترجیح دی ہے؟

5۔ نظم 'مفلسی' کے کسی دو بند کی تشریح کیجیے؟

6۔ نظم 'آدمی نامہ' کے کسی دو بند کی تشریح کیجیے؟

5.6 سوالات کے جوابات

1۔ نظیر اکبر آبادی اٹھارہویں صدی کے مقبول و معروف شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے موضوعات اور اسلوب سے اپنی شناخت بنائی۔ ان کے ہم عصروں میں میر تقی میر، محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

2۔ نظیر اکبر آبادی کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں مقامی زبان کے الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ وہ روزمرہ کے شاعر ہیں اور خالص ہندستانی لہجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندستانی عناصر کی بھرمار ہے۔ یہ تمام باتیں ان کی شناخت بناتی ہیں۔

3۔ نظیر اکبر آبادی کو اس لیے عوامی شاعر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں عوام سے براہِ راست جڑی باتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ روزمرہ کی زندگی، تماشے، رسم و رواج، موسم، تیوہار، پالتو جانور، وغیرہ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں اور انھیں روزمرہ کی عوامی زبان میں پیش کیا ہے۔

4۔ نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کی تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظم ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ ان کا بیشتر کلام اسی صنف شاعری میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

5۔ نظم 'مفلسی' کے دو بند کی تشریح

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں　　مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں　　وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے فطری موضوعات کے علاوہ سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔ ایسی ہی نظموں میں نظیر کی نظم ''مفلسی'' کا شمار ہوتا ہے۔ یہ نظم نظیر کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اس نظم کو انہوں نے پانچ مصرعوں کے بند یعنی مخمس میں تحریر کیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں سماجیاتی مطالعہ کے ساتھ نظیر نے ان حقائق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے مفلسی اور بدحالی کے پھیلنے کا امکان رہتا ہے۔ 19 بند پر مشتمل نظم ''مفلسی'' بنیادی طور پر وضاحتی انداز کی نظم ہے۔ اس نظم میں نظیر نے اپنے مشاہدے کی گہرائی اور تشبیہ و تلمیح کے استعمال اور محاورے کی گرمی سے ایسا ماحول تیار کر دیا ہے کہ یہ نظم مفلسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے نظم 'مفلسی' کے اس بند میں بتایا ہے کہ اہل علم و فضل بھی ہوں اور ان کو مفلسی گھیر لے تو وہ غریبی کی وجہ سے کلمہ تک بھول جانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بھوکے سے کوئی الف کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے ب بتاتا ہے۔ غریب کے بچوں کو پڑھانے والا سدا مفلس ہی رہتا ہے اور اگر غریب کے گھر مفلسی آ جا تو وہ عمر بھر جا نہیں سکتی۔ اگر مفلس کسی مجلس کے درمیان اپنا حال بیان کرتا ہے تو لوگ یہی تصور کرتے ہیں کہ اس نے روزگار حاصل کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہے۔ غریب کے پاس لاکھوں علم و کمال ہوں لیکن وہ مفلس ہو تو ہزار احتیاط کے باوجود اس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ اس طرح مفلسی انسان کی تمام صلاحیتوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر　　دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر　　جس طرح کتّے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

نظم 'مفلسی' کے اس بند میں نظیر اکبر آبادی نے بتایا ہے کہ جب انسان مفلس بن جاتا ہے تو اسے اپنی عزت سے زیادہ روٹی یا نان پیاری ہوتی ہے اور وہ ایک ایک روٹی پر جان دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی روٹی اور کھانے کا خوان (دسترخوان) دیکھتا ہے اس پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس طرح مفلسی نہ صرف روٹی کے لیے جھگڑا کراتی ہے بلکہ حد درجہ ذلیل و رُسوا بھی کرواتی ہے۔ مفلسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیا کی بنیاد پر جن کاموں سے انسان کو خود بچائے

رکھتا ہے وہ سب کام کرنے پر وہ مجبور ہو جاتا ہے اور اس میں حلال و حرام کی بھی تمیز باقی نہیں رہتی۔ غرض جسے شرم و حیا کہتے ہیں مفلسی کی وجہ سے وہ انسان سے رخصت ہو جاتی ہے۔

6۔ نظم 'آدمی نامہ' کے دو بند کی تشریح

دُنیا میں بادشہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی اور مُفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار و بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو چبا رہا، سو ہے وہ بھی آدمی

'آدمی نامہ' نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہور نظم ہے۔ نظیر اکبر آبادی انسانی زندگی کے حالات و مسائل سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کا کلام سماجی و معاشرتی حالات کی حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بقول احتشام حسین:

''نظیر پہلا شاعر ہے جو زمین پر کھڑا معلوم ہوتا ہے۔''

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں چاہے بادشاہ ہو یا مفلس، دولت مند ہو یا فقیر، وہ آدمی جسے آرام کے ساتھ کھانا میسر ہے اور وہ آدمی جو بھیک مانگ کر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے سب انسان ہیں۔

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی، رہنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کے لیے آگ کی طرح مصیبت اور پریشانی کا سبب بھی ہے تو وہی محبت کی طرح راحت اور روشنی کا ذریعہ بھی۔ اسی دنیا میں ہی آدمی کی تمام خوبصورتی اور بدصورتی، اچھائی اور برائی اجاگر ہوتی ہے اور آدمی ہی کو شیطانی حرکات میں مہارت حاصل ہے یعنی وہ مکر و فریب سے کام لیتا ہے، تو دوسری طرف وہی صحیح راستہ دکھانے کا کام بھی کرتا ہے۔

5.7 فرہنگ

لفظ	معنی
صداقت	سچائی
مشترکہ	ساجھا
امین	محافظ

وسیع	پھیلا ہوا
وفات	موت
نشیب وفراز	اتار چڑھاؤ
عمیق	گہرا
مشاہدہ	کسی چیز کو غور سے دیکھنا
شغف	دلچسپی
منکسر المزاج	نرم مزاج
منسلک	جڑا ہوا
عہد زریں	بہترین زمانہ
جزئیات	جز کی جمع
مفلس وگدا	فقیر محتاج
زردار	دولت مند
نار	آگ
نور	روشنی
حسن وقبح	اچھا اور برا
مکر وزُور	دھوکہ، فریب، دغا
ہادی	راستہ دکھانے والا
رہنما	راہ دکھانے والا
خطبہ خواں	خطبہ دینے والا
وارنا	قربان کرنا
زرق برق	شان وشوکت
فرق	پیشانی
غرب	مغرب
شرق	مشرق
کم خواب	ریشمی لباس

اشراف	شریف لوگ
حرمت	عزّت
گدا	فقیر
نان	روٹی
انصرام	انجام دینا
حلال خور	مہتر

5.8 کتب برائے مطالعہ

محمد حسن (ہندوستانی ادب کے معمار)	نظیر اکبر آبادی	ساہتیہ اکادمی دہلی 1986
نیاز فتح پوری	ماہ نامہ ''نگار'' نظیر نمبر	جنوری 1940
اکبر علی بیگ، محمد علی اثر (مرتبین)	نظیر شناسی	ادارۂ شعر و حکمت 1987
شمس الحق عثمانی	نظیر فہمی (دو جلدوں میں)	دلّی کتاب گھر 2016
سید محمد عبدالغفور شہباز	زندگانی بے نظیر	ترقی اردو بیورو نئی دلّی 1981
سید طلعت حسین نقوی	نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ	نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد 1990
طلعت حسین نقوی	نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1991
سلیم جعفر	گلزار نظیر	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد 1951
مرزا فرحت اللہ بیگ	دیوان نظیر	انجمن ترقی اردو ہند 1942
رشید حسن خاں	انتخاب نظیر اکبر آبادی	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1992

اکائی 6 محمد حسین آزاد کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 محمد حسین آزاد کی نظم نگاری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

6.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

6.3.2 محمد حسین آزاد کا فن

6.3.3 متن اور اس کی تشریح

6.4 آپ نے کیا سیکھا

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

6.6 سوالات کے جوابات

6.7 فرہنگ

6.8 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے
- محمد حسین آزاد کے عہد کی جانکاری حاصل کریں گے
- ان کے ہم عصروں کی جانکاری حاصل کریں گے
- محمد حسین آزاد کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے
- محمد حسین آزاد کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت سے روشناس ہوں گے

6.2 تمہید

اس سبق میں ہم محمد حسین آزاد کی نظم نگاری پر تفصیلی گفتگو کریں گے اور ان کی دو نظموں 'محنت کرو' اور 'نوطرز مرصع' کا مطالعہ کریں گے لیکن اس سے پہلے نظم کے معنی اور نظم نگاری پر مختصراً روشنی ڈالنا

ضروری ہے ۔علم مدن (Civics) میں 'نظم' لفظ کا استعمال انتظام و اہتمام کے لیے ہوتا ہے۔فارسی اور اردو شاعری کے مطابق یہ نثر کی ضد ہے۔مثلاً شعر، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، غزل اور دوسرے اصناف شعر۔لیکن بعد میں جب موضوعاتی شاعری ہونے لگی اور مثنوی کہی جانے لگی تو منظوم کلام کے کچھ قواعد اور اصول متعین کیے گئے ۔اس کے بعد سے کچھ خاص طرح کے اشعار کے مجموعے کو نظم کہا جانے لگا۔اس سلسلے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو۔اس کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے۔''

(مضمون اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقا: نگار لکھنو، جنوری۔فروری 1957۔ص 129)

1857 کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب کے بعد ہی 'نظم' ایک منفرد صنف سخن کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ہم اسے نشاط ثانیہ (Renaissance) بھی کہہ سکتے ہیں۔بقول حامدی کاشمیری:

''یورپی تہذیب کے زیر اثر جدید اور عصری خیالات، تصورات اور میلانات کا ایک نئے ڈھنگ سے اظہار کی ضرورت کے شعور کے ساتھ ساتھ، شاعری کے نئے نئے نمونے وجود میں آنے لگے۔نظم کا جدید تصور بھی ان ہی نئے خیالات کی پیداوار ہے۔''

(جدید اردو نظم اور یورپی اثرات: مجلس اشاعت ادب دہلی۔باراول مارچ 1968۔ص 20)

اردو مرثیہ نگاروں اور نظیر اکبر آبادی نے بہت پہلے اس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو ایک عرصے بعد جدید رنگ اختیار کرنے والی تھی۔انہوں نے اپنے وقت میں ہی ان کے لیے راستہ تیار کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو اصلاح کا رُخ چھوڑا تھا بعد میں آنے والوں نے اس کی آبیاری کر کے وہ درخت پروان چڑھایا۔انقلابِ زمانہ اردو شاعری کے روایتی انداز کے لیے موزوں نہیں تھا۔ دلی اور لکھنو کی سلطنتیں برباد ہو جانے کی وجہ سے شعرا کی سرپرستی ختم ہوگئی۔لوگ زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے تھے۔اب انہیں قدیم طرز تغزل میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔حالانکہ غزل کی مقبولیت آج بھی اتنی ہی ہے۔لیکن 1857 کے غدر نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔اس تبدیلی کی ایک اور وجہ تھی انگریزی تعلیم۔انگریزی ادب نے ہمارے ادیبوں کو بہت متاثر کیا۔لیکن جدید رنگ کی تائید کرتے ہوئے ان کی قدامت پرستی قائم رہی۔ان کا مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کے وسیع دائرے میں قدیم رنگ کے تصنع و تکلف کی جگہ جدید رنگ شامل ہو جائے۔

بیکار کے مبالغے، تشبیہات، بے مزہ لفاظی کی مخالفت کرنا چاہتے تھے۔جدید رنگ کی ترویج و ترقی ہوئی اور نوجوان طبقے نے اسے شوق کے ساتھ بہت جلد قبول کر لیا۔اس دور میں نئے موضوعات شامل کیے گئے۔ان کے لیے غزل کا دائرہ تنگ ہونے کی وجہ سے مثنوی، مسدس، رباعی اور قطعات کو

بڑھاوا ملا۔ نیچرل مضامین کو موضوع بنایا گیا۔ مثال کے طور پر پہاڑوں کے خوبصورت مناظر، ندیوں کی روانی، برسات، جاڑے اور گرمی کی بہاریں جدید شاعری کا موضوع بنے جو قدیم شعرا کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ الگ الگ موضوعات پر نظمیں کہنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مثلاً تاریخی، سیاسی، اخلاقی، نصیحت آموز نظمیں کہی جانے لگیں۔ غزلوں میں بھی نئے مضامین شامل ہوئے اور انسانی جذبات و کیفیات کا سچا اظہار اور دنیا کی بے ثباتی کا پُر اثر الفاظ میں بیان اس کا حصہ بن گئے۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی نے اس طرح کی غزلیں کہیں۔ انگریزی نظم کی کچھ بحریں بلینک ورس غیرہ کو اردو میں شامل کیا گیا۔ مولوی سید حیدر صاحب طباطبائی، مولانا شرر وغیرہ نے ان بحروں میں شاعری کی ہے اور آج بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں۔ مولوی عظمت اللہ نے ہندی دوہروں کو اردو نظم میں شامل کیا۔ مولانا حالی نے مسدس یعنی چھ مصرعوں والی نظم کو شہرت عطا کی۔ جدید شاعری میں سادگی صفائی اور واقیت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی لیے موجودہ دور کی نظمیں بہت پُر اثر اور جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔ قیمتی اور وسیع ذخیرہ الفاظ، نئے مضامین، نئی تشبیہات و تخیلات، نئے خیالات اور ان کے استعمال و اظہار کی نئی طرزیں سامنے آئیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کو نئی شاعری کا معمار کہا جاتا ہے۔ وہ جدید رنگ کے بانی اور مجدد تھے۔ وہ نامور ادیب، مشہور نثر نگار و نقاد اور ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ شہرت یافتہ اخبار نویس بھی تھے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان اور فلولوجی کے ماہر تھے۔ مولانا آزاد کا عہد ملک کی تاریخ کا عبوری دور ہے۔ یہ دور تہذیبی تصادم کا دور ہونے کے ساتھ زوال، انحطاط، مایوسی، محرومی اور شکست کا آئینہ دار بھی ہے اور غیر ملکی اقتدار کا مرقع بھی۔ اسی ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہیں ان کی تربیت ہوئی۔ ان کی شخصیت میں بے تکلفی اور سادہ مزاجی تھی۔ سبھی سے خلوص اور پیار سے ملتے اور کسی کے ساتھ کوئی تفریق نہیں کرتے۔ تاریخ اور سیر و سیاحت میں بہت دلچسپی تھی۔ آزاد کی طبیعت میں نازک خیالی، لطافت، شگفتگی اور جدت طرازی قدرت کی عطا کردہ تھی۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخندانِ فارس، کلام اکبری، کلام ذوق کی تدوین، مکتوبات آزاد، فلسفۂ الٰہیات وغیرہ ان کی اہم نثری مکتوبات ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے درسی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

6.3 محمد حسین آزاد کی نظم نگاری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

6.3.1 حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو جدید اردو نثر و نظم کا بانی کہا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد 10 جون 1830 میں دہلی کے ایک شہرت یافتہ عالم، مذہبی رہنما اور مشہور صحافی مولانا محمد باقر کے گھر پیدا ہوئے۔ آزاد کا نام ان کے والد کے دوست ذوق دہلوی نے محمد حسین رکھا۔ آگے چل کر انہوں نے اپنا تخلص آزاد رکھ لیا اور ذوق کے شاگرد ہوئے۔ چار برس کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پھوپھی نے ان کی پرورش کی۔ محمد باقر نے دہلی کا پہلا ہفت روزہ اردو اخبار 'دہلی اردو اخبار'

کے نام سے نکالا۔ محمد حسین آزاد نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور انہیں کی صلاح پر دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ دورانِ تعلیم آزاد کو وظیفہ ملتا رہا اور انہوں نے بہترین مضامین لکھنے کے لیے انعامات بھی حاصل کیے۔ تعلیم مکمل کر کے انہوں نے اخبار اور پریس کے کام میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ آزاد کو شعر و ادب کا بھی شوق تھا شاعری میں انہوں نے ذوق کی شاگردی حاصل کی۔ وہ بہت ذہین تھے۔ ان کی تقریر کا جادو سننے والوں کا دل جیت لیتا تھا۔ ان کی طبیعت میں محنت پسندی بھی بہت زیادہ شامل تھی۔ 1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے مولوی باقر پر غلط الزام لگا کر انہیں شہید کر دیا۔ ان کا گھر بار لُٹ گیا جان بچا کر اہلِ خانہ کے ساتھ بہت مشکل سے نکل پائے۔ بے سروسامانی کی حالت میں آزاد دہلی سے ہجرت کر کے پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے لکھنو پہنچے۔ لکھنو کے مختصر قیام میں آپ نے میر انیس، مرزا دبیر، میر کلو عرش اور دوسرے مشاہیر ادب سے ملاقات کی۔ جلد ہی لکھنو سے بھی انہیں رختِ سفر باندھنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے دکن کا رُخ کیا اور کچھ دنوں تک مدراس میں قیام کیا اور مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہاں بھی ان کا دل نہیں لگا پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں سے مالوہ ہوتے ہوئے پنجاب پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے اہلِ خانہ کو بھی بلا لیا۔ 1861 میں وہ لاہور چلے گئے۔ کچھ دنوں تک پوسٹ آفس میں کام کیا پھر محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشنِ تاج پوشی کے موقعے پر ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 1887 میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔ 16 اکتوبر 1889 سے وہ مسلسل بیمار رہنے لگے اور 22 جنوری 1910 کو لاہور میں نصف شب میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

6.3.2 محمد حسین آزاد کا فن

محمد حسین آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ نقاد، مورخ، نثر نگار اور شاعر بھی تھے۔ وہ اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز ہونے کے ساتھ جدید اردو نظم کے بنیاد گزار بھی ہیں۔ انہوں نے جدید نظم نگاری کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی لیے انہیں جدید رنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں انہوں نے نظم گوئی کی جو روایت شروع کی آج بھی شعراء کی پسند ہے۔ اردو ادب میں بطور شاعر ان کا مقام بہت بلند نہیں لیکن ان کی شاعری نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے۔ وہ اردو کے فطری شاعر تھے۔ جب آزاد نے شعر کہنا شروع کیا تو اپنے عہد کے عام نوجوانوں کی طرح غزل گوئی سے ہی ابتدا کی۔ بعد میں انہوں نے قصیدے اور مرثیے بھی کہے۔ لیکن شاعری کے حوالے سے اردو ادب میں انہیں نظم نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ آزاد کو شعر و شاعری کا شوق اوائل عمر سے ہی تھا۔ انہوں نے جب شعر کہنا شروع کیا تو عام نوجوانوں کی طرح غزل گوئی سے ہی ابتدا کی۔ آزاد کی شاعری ان کے والد کے دوست ذوق دہلوی کی صحبت اور تربیت میں پروان چڑھی۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی شعرا میں آزاد اور

حالی ہی وہ نمایاں شعرا تھے جن کی نگاہوں میں نئی شاعری کے نقوش ابھرنے لگے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ انگریزی شاعری کے اصل یا ترجمے سے واقف ہو رہے تھے۔ یہ دونوں شعرا قدیم شاعری کی خیالی اور فرضی بیانیے سے ناخوش تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ نظم کی تکمیل تبھی ممکن ہے جب موضوعات میں صداقت اور بیان میں تسلسل ہو۔ آزاد اور حالی نے جس جدید نظم کی بنیاد رکھی وہ جدید اور قدیم کا معتدل آمیزہ ہے۔ پہلے موضوعات میں تبدیلی لائی گئی پھر ہیئت کے تجربے بھی کیے گئے۔ انہوں نے حالی کے ساتھ اردو میں فطری شاعری کی بنیاد رکھی اور اپنی شعری تخلیقات کے ساتھ اسے ایک نیا موڑ دیا۔ آزاد اور حالی نے انگریزی شاعری کی طرز پر اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ اردو شاعری کے اسکاٹ تھے۔ اردو شاعری انہیں کی بدولت نیچرل شاعری کے اصل معنی سے واقف ہوئی۔ انہوں نے کرنل ہالرائیڈ کی تائید و تعاون سے بزمِ ادب انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی جس میں قومی اور اخلاقی موضوعات پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس کا مقصد اردو شاعری کی اصلاح اور ترقی تھا۔ جس میں مصرع کی جگہ عنوان دیا جاتا تھا۔ یہیں سے اس دور کا آغاز ہوا جس کا عہد حاضر بھی ممنون ہے۔ حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حسن کی تصوراتی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف آ گیا۔ معاشرتی اور سیاسی پہلو پر نظمیں کہنے کی شروعات ہوئی اور وہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ آزاد نے نظم نگاری میں لسانی زور آزمائی سے کام لیا ہے۔ فطری مناظر کی پیشکش میں خارجی حسن کی تصویر کشی ملتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دلآویز مشابہتوں کے ذریعے بصری پیکروں کا سلسلہ قائم کر دیتے ہیں۔ جسکی وجہ سے فطرت کے مختلف اجزاء سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت مشفق بھی ہے اور اذیت رساں بھی۔ اسی وجہ سے ان کی فطرت نگاری میں تنوع ملتا ہے۔ آزاد زندگی اور حقیقت کے ہر پہلو کو شاعری میں سمونے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں بہت اہم نظمیں لکھیں۔

آزاد نے انگریزی نظموں سے خیالات اخذ کر کے متعدد نظمیں لکھیں۔ مثلاً 'محنت کرو'، 'ایک تارے کا عاشق'، 'جسے چاہو سمجھ لو'، 'شرافت حقیقی'، 'جشن جوبلی' وغیرہ۔ ان کی مثنویاں شبِ قدر، خواب امن، صبح امید، ابر کرم خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ آزاد کے شعری مجموعے ' خمکدۂ آزاد' اور مجموعۂ نظم کے مطالعہ سے اردو شاعری میں ان کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ نظم آزاد میں مثنوی کے ساتھ غزلیات، اشعار، قصائد، رباعیات اور کچھ اخلاقی نظمیں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں سنجیدہ تغزل ملتا ہے۔ لیکن نظمیں شوخ اور لطیف رنگ میں ہیں۔ انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ مل کر شعرا کو جدید طرز کی نظمیں کہنے پر راغب کیا۔ وہ ایسا سنگ میل ہیں جہاں سے جدید اردو شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے مخالفت کے باوجود قدیم اردو شاعری کو عشق و عاشقی، گل

وبلبل، مبالغہ، تکلف وتصنع کی قید سے باہر نکالا اور نئی طرز شاعری کو مقبول عام کیا۔ اردو شاعری میں نئی روح پھونک کر اسے نئے اسلوب وانداز سے روشناس کرایا۔ انہوں نے نیچر کی پیروی کی اور صاف زبان میں اپنی باتیں کہیں۔

آزاد کی نظموں میں فلسفیانہ عمق اور گہرائی نہیں ہے۔ ان کا لہجہ ایک سا رہتا ہے۔ فارسی شاعری کے منفی اثرات کا ذکر کرنے کے باوجود ان کی شاعری پر فارسی شاعری کا بہت اثر ملتا ہے۔ حب الوطنی، ملکی حالات آزاد کی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ منظر نگاری بہت دلکش ہے۔ لطافت اور نزاکت کے ساتھ جوش و ولولہ بھی ملتا ہے۔ داخلی کیفیات کم ملتی ہیں۔ رعایت لفظی کی پابندی ملتی ہے۔ حقیقی مناظر کی خوبصورت تخیلی پیشکش ملتی ہے۔ لیکن قلب کی عمیق اور نازک کیفیات ان میں نہیں ملتی ہیں۔ آزاد کی نظموں کا ایک بڑا عیب ان کی طوالت ہے۔ وہ پرشکوہ زبان کا استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن ترتیب کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے روانی ختم ہو جاتی ہے۔ شعر میں ناہمواری اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض جگہ ان کا انداز بہت سادہ اور بے رنگ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر انہوں نے ادیبانہ انداز اپنایا ہے۔ حالانکہ محمد حسین آزاد بہت بڑے یا اچھے نظم گو نہیں ہیں لیکن ان کی نظم نگاری اس لحاظ سے اہم ہے کہ انہوں نے ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے روایتی مضامین سے نکال کر اردو نظم کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا۔ خودستائی، دربار اکبری، دوستی، خوبیو، محنت کرو، ایک تارے کا عاشق، جسے چاہو سمجھ لو، مبارک باد جشن جبلی، سلام علیک، معرفت الٰہی وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

6.3.3 متن اور اس کی تشریح

I محنت کرو

ہے امتحاں سر پر کھڑا محنت کرو محنت کرو باندھو کمر بیٹھے ہو کیا محنت کرو محنت کرو
بیشک پڑھائی ہے سوا اور وقت ہے تھوڑا رہا ہے ایسی مشکل بات کیا محنت کرو محنت کرو
شکوے شکایت جو کہ تھے تم نے کہے ہم نے سنے جو کچھ ہوا اچھا ہوا محنت کرو محنت کرو
محنت کرو انعام لو انعام پر اکرام لو جو چاہوگے مل جائیگا محنت کرو محنت کرو
جو بیٹھ جائیں ہار کر کہہ دو انہیں للکار کر ہمت کا کوڑا مار کر محنت کرو محنت کرو
تدبیریں ساری کہہ چکے باتوں کے دریا بہہ چکے بک بک سے اب کیا فائدہ محنت کرو محنت کرو

یہ بیج اگر ڈالو گے تم دل سے اسے پالو گے تم دیکھو گے پھر اس کا مزہ محنت کرو محنت کرو
محنت جو کی جی توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر کر دو گے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو
کھیتی ہو یا سوداگری ہو بھیک ہو یا چاکری سب کا سبق یکساں سنا محنت کرو محنت کرو
جس دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے دھندوں میں پھنسے پڑھنے کی پھر فرصت کجا محنت کرو محنت کرو
بچپن رہا کس کا سدا انجام کو سوچو ذرا یہ تو کہو کھاوگے کیا محنت کرو محنت کرو

تشریح

اس نظم کا مطالعہ کرتے وقت یہ خیال ذہن میں ابھرتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے جب یہ نظم کہی ہوگی اس وقت ان کے دماغ میں یہ قول رہا ہوگا کہ انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔ محمد حسین آزاد اس نظم میں بظاہر طالب علموں سے مخاطب ہیں لیکن ان کا پیغام پوری قوم کے لیے ہے۔ آزاد اس نظم میں سب سے پہلے طالب علموں کو مخاطب کر کے انہیں محنت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر تمہیں مجھ جیسے استاد سے کوئی شکایت ہے تو یہ وقت اس پر غور کرنے کا نہیں ہے۔ وہ سب بھول کر اپنی طاقت پڑھائی پر خرچ کرو۔ جو طلبا سست، آرام طلب اور بزدل ہیں انہیں ہمت کے کوڑے مار کر جگاؤ اور جوش دلاؤ۔

ہے امتحاں سر پر کھڑا محنت کرو محنت کرو
باندھو کمر بیٹھے ہو کیا محنت کرو محنت کرو

مندرجہ بالا شعر محمد حسین آزاد کی نظم محنت کرو کا پہلا شعر ہے۔ اس شعر میں وہ طالب علموں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ امتحان کے دن قریب آ رہے ہیں جتنی زیادہ محنت کر سکتے ہو کر لو۔ بیٹھ کر وقت برباد کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ڈٹ کر محنت کرنی ہوگی۔

بیشک پڑھائی ہے سوا اور وقت ہے تھوڑا رہا
ہے ایسی مشکل بات کیا محنت کرو محنت کرو

وہ کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہے کہ سبق بہت زیادہ ہے اور آپ کے پاس وقت بہت کم بچا ہے لیکن یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وقت کی کمی کا رونا رونے سے بہتر ہوگا جو بھی وقت ہے پاس میں اس کا استعمال کریں اور امتحان کی تیاری میں پوری محنت لگا دیں۔

شکوے شکایت جو کہ تھے تم نے کہے ہم نے سنے
جو کچھ ہوا اچھا ہوا محنت کرو محنت کرو

اس شعر میں آزاد اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں اپنے استادوں سے جو بھی

شکایتیں ہیں اسے یہ سوچ کر بھول جاؤ کہ جو ہوا اچھے کے لیے ہوا اور اپنی محنت پڑھائی میں لگاؤ۔

محنت کرو انعام لو انعام پر اکرام لو
جو چاہوگے مل جائیگا محنت کرو محنت کرو

آزاد کہتے ہیں کہ محنت کے نتیجے میں انعام واکرام سے نوازے جاؤ گے۔جس چیز کی خواہش کروگے وہ تمہیں حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔اس لیے کبھی محنت کرنے سے پیچھے نہیں ہونا۔

جو بیٹھ جائیں ہار کر کہہ دو انہیں للکار کر
ہمت کا کوڑا مار کر محنت کرو محنت کرو

شاعر کہہ رہا ہے کہ صرف خود محنت نہیں کرو بلکہ جو مایوس ہوکر بیٹھ گئے ہیں ان کو بھی ہمت دو اور محنت کرنے کے لیے پھر سے تیار کرو۔انہیں جوش دلانے کی ضرورت ہے۔

تدبیریں ساری کہہ چکے باتوں کے دریا بہہ چکے
بک بک سے اب کیا فائدہ محنت کرو محنت کرو

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ ساری تدبیریں آزمالیں،باتوں میں وقت ضائع کرلیا اب اور باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اس لیے کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا ضروری ہے۔

یہ بیج اگر ڈالوگے تم دل سے اسے پالوگے تم
دیکھوگے پھر اس کا مزہ محنت کرو محنت کرو

شاعر کا کہنا ہے کہ اگر تم اپنے دل میں محنت کا بیج ڈال لوگے اور اس پر عمل کروگے تو اس کا پھل بہت مزے کا ہوگا۔لیکن اس کے حصول کے لیے محنت کرنا بہت ضروری ہے۔

محنت جو کی جی توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر
کر دوگے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو

آزاد اس شعر میں کہہ رہے ہیں کہ اپنے شوق کو ایک طرف رکھ کر جی جان سے کی جانے والی محنت کرنے والے کو فوراً اچھا نتیجہ حاصل ہوجاتا ہے۔محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی ہے۔

کھیتی ہو یا سوداگری ہو بھیک ہو یا چاکری
سب کا سبق یکساں سنا محنت کرو محنت کرو

اس شعر میں آزاد کا کہنا ہے کہ چھوٹا بڑا کسی بھی طرح کا کام ہو کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا

ضروری ہے۔ جتنی زیادہ محنت کریں گے اس کا نتیجہ اتنا اچھا ہوگا۔

جس دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کجا محنت کرو محنت کرو

آزاد طالب علموں سے کہہ رہے ہیں کہ ابھی تمہارے پاس وقت ہے پڑھائی کے لیے جتنی محنت کر سکتے ہو کرو ورنہ بڑے ہو کر تمہیں دوسرے کاموں سے فرصت نہیں ملے گی اور چاہ کر بھی کچھ پڑھنا ممکن نہیں ہوگا۔

بچپن رہا کس کا سدا انجام کو سوچو ذرا
یہ تو کہو کھاوگے کیا محنت کرو محنت کرو

آزاد اس شعر میں طالب علموں کو اس بات سے آگاہ کر رہے ہیں کہ یہ بچپن ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اپنے مستقبل کے لیے سوچو کہ بڑے ہو کر روزی روٹی کا ذریعہ کیا ہوگا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ ابھی علم حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کی جائے۔

II نوطرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامان کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید

پتے تھے آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے
اور تھے درخت برف نے بلّور کر دئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں
ہمت کے ہاتھ میں ہے اٹھائے یہ نشاں
ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!
ہمت کا اس کی حال میں لکھ کر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا شکوہ شان تھی اس کے نشان سے
چلتا قدم اٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منھ میں نہ تھی صدا
لیکن خموشی اس کی بآواز کرنا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو!

تشریح

محمد حسین آزاد کو اپنے علاج کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے شملہ میں قیام کرنا پڑا تھا۔ یہ نظم نوطرز مرصع اسی دوران تحریر کی گئی۔ اس نظم میں ہمیں آزاد کے اندر کا داستان گو جلوہ گر دکھتا ہے۔ اس نظم کا عنوان بھی اس کی وضاحت کرتا ہے۔

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

محمد حسین آزاد نے اس نظم میں خوبصورت منظر نگاری کی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک بار میری قسمت کے ستارے بلند ہوئے اور مجھے شملہ میں سردی کا موسم بتانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑوں کی ٹھنڈ کا بہت خوبصورت منظر پیش کیا ہے انہوں نے کہ ٹھنڈ کی وجہ سے بہتے ہوئے پانی ایک جگہ ٹھہر گئے تھے اور جو رکا ہوا پانی ہے وہ جم کر برف بن گئے۔

دامان کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید

ان دو اشعار میں شاعر پہاڑی علاقے کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہاڑوں کے دامن میں سورج بادلوں کی رضائی لپیٹے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ گھر کی ساری دیواریں اور دروازے جہاں تک نظر جا رہی ہے سفید ہیں اور باہر جانے پر پہاڑی وادیاں سب برف سے ڈھک کر سفید ہو رہی ہیں۔

پتے تھے آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے
اور تھے درخت برف نے بلّور کر دئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا

سردیوں کے موسم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ درختوں کے سارے پتے گر گئے ہیں اور خالی بچے درخت برف سے ڈھک کر سفید ہو گئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ سردیوں کی راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں ایسی ہی ایک رات کا ذکر کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں کہ تھک کر وہ گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے۔

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں ہمت کے ہاتھ میں ہے اٹھائے یہ نشاں
ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

جاڑے کی اس رات میں جبکہ ہر طرف ٹھنڈ اور سناٹے کا راج تھا ان کی نظر ایک صحت مند نوجوان پر پڑی جو اپنے ہاتھوں میں ہمت کا جھنڈا اٹھا کر بھاگتا جا رہا تھا جس پر روشن الفاظ میں یہ پیغام لکھا تھا کہ آگے بڑھو۔ یہاں شاعر یہ پیغام دے رہے ہیں کہ حالات جو بھی ہوں حوصلہ بلند رکھنا ضروری ہے تبھی سفر آسان ہوگا۔

ہمت کا اس کی حال میں لکھ کر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا

جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا شکوہ شان تھی اس کے نشان سے

آزاد ان اشعار میں کہتے ہیں کہ اس نوجوان کی ہمت اور حوصلے کا بیان کرنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے دریا کو کاغذ کے برتن میں سمیٹنے کا کام۔ اس نوجوان کی شان وشوکت اور آن بان اس کے پرچم کی وجہ سے تھی۔

چلتا قدم اٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا

کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا

دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو!

ان اشعار میں شاعر اس نوجوان کے عزم اور حوصلے کا بہت خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح وہ اس سرد اور برفیلی رات میں جوش وخروش کے ساتھ سر کو جھکا کر آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اسے کس بات کی فکر پریشان کر رہی ہے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے مزاج بگڑے ہوئے ہیں۔ اس نوجوان کی فکر اسے آگے بڑھنے کے لیے آواز دے رہی تھی کہ کہیں وہ تھک کر راستے میں رک نہ جائے۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا

- محمد حسین آزاد کے عہد اور ان کے ہم عصروں کی جانکاری حاصل کی۔
- محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوئے۔
- جدید شاعری اور نظم نگاری کی تردیج وترقی میں محمد حسین آزاد نے جو کردار نبھایا اس کا مطالعہ کیا۔
- محمد حسین آزاد کی نظموں محنت کر واور نوطرز مرصع کا مطالعہ کیا۔
- ان دو نظموں کی تشریح کا مطالعہ کیا۔

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1 محمد حسین آزاد کہاں پیدا ہوئے تھے؟

2 محمد حسین آزاد کے والد کا نام اور پیشہ کیا تھا؟

3 محمد حسین آزاد کے ہم عصروں کے نام لکھیں۔

4 محمد حسین آزاد کی چند مشہور نظموں کے نام لکھیں۔

5 محمد حسین آزاد نے اپنے آخری دنوں میں کہاں قیام کیا؟

6.6 سوالات کے جوابات

1 محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔

2 محمد حسین آزاد کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ وہ پیشے سے مدرس اور صحافی تھے۔

3 الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی ذکاءاللہ، نذیر احمد وغیرہ محمد حسین آزاد کے ہم عصر تھے۔

4 خودستائی، دربار اکبری، دوستی، خوبیو، محنت کرو، ایک تارے کا عاشق، جسے چاہو سمجھ لو مبارک باد جشن جبلی، سلام علیک، معرفت الٰہی وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

5 محمد حسین آزاد نے اپنے آخری دنوں میں لاہور، پنجاب میں قیام کیا تھا۔

6.7 فرہنگ

لفظ	معنی
اقبال	زمانے کا موافق ہونا
یخ	بہت ٹھنڈا
کوہسار	پہاڑی جگہ
بلّور	صاف
پیشہ	کام
نشاں	یادگار
ملال	افسوس
کوزے	مٹی کے برتن
صدا	آواز
مناظر	نظارے

یکساں	ایک سا
ہجرت	وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا
عہدہ	منصب
ہم عصر	ایک وقت کا
طرز	طریقہ
آغاز	شروع
مبالغہ	کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
اسلوب	طرز
تصنع	فریب
ملال	افسوس
زوال	اتار
بانی	بنیاد رکھنے والا
اصطلاح	کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ خاص مفہوم مقرر کر لینا

6.8 کتب برائے مطالعہ

1	محمد حسین آزاد	عتیق اللہ	اردو اکیڈمی، دہلی، 2008
2	محمد حسین آزاد	ساحل احمد	لٹریری بک سنٹر، الہ آباد، 1985
3	محمد حسین آزاد	جہاں بانو بیگم	ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، 1940
4	محمد حسین آزاد	مظفر حنفی	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1996
5	محمد حسین آزاد ایک تخلیقی فنکار	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، 1996
6	محمد حسین آزاد بحیثیت محقق	قاضی عبدالودود	ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، 1984
7	محمد حسین آزاد۔حیات اور تصنیف	ڈاکٹر اسلم فرخی	انجمن ترقی اردو، پاکستان، 1965
8	محمد حسین آزاد	نند کشور وکرم	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1904
9	مولانا محمد حسین آزاد اور ان کا شعری سفر	ڈاکٹر رشید اشرف خان	اردو چینل پبلیکیشنز ممبئی، 2015
10	مجموعۂ نظم آزاد	مولوی محمد حسین آزاد	اسٹیم پریس، لاہور، 1899

اکائی 7 مولانا الطاف حسین حالی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 مولانا حالی کی شاعری

7.3.1 مولانا الطاف حسین حالی کا تعارف

7.3.2 مولانا حالی کی شاعرانہ فکر

7.3.3 مولانا حالی کی شعری خصوصیات

7.3.4 مولانا حالی کی منتخب نظموں کی تشریحات

I. مرثیۂ دہلی مرحوم

II. برکھارُت

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالات کے جوابات

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- مولانا الطاف حسین حالی کے حالات زندگی اور کارناموں سے واقف ہوں گے
- مولانا حالی کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے
- مولانا حالی کے شعری امتیازات کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے
- مولانا حالی کی دو نظموں کی تشریح سمجھ سکیں گے

7.2 تمہید

الطاف حسین حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں شادی کے بعد تعلیم کی غرض سے دلی چلے آئے۔ 1856 میں حصار میں نوکری کی مگر غدر کے ہنگاموں کی وجہ سے وطن واپس آنا پڑا۔ کچھ

عرصے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔انگریزی ادب سے واقفیت انھیں یہیں ہوئی جس نے ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔اسی سے متاثر ہوکر انھوں نے مقدمۂ شعروشاعری لکھی جو اردو تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب کہی جاتی ہے۔

حالی کا شمار انیسویں صدی کے سماجی اور ادبی مصلحین میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے سماج میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔یوں تو حالی نے نظم ونثر میں کافی سرمایہ چھوڑا مگر ان کی شہرت نثر میں مقدمۂ شعروشاعری، یادگارِ غالب حیاتِ جاوید، حیات سعدی اور نظم میں مسدسِ حالی کی وجہ سے ہے۔

7.3 مولانا حالی کی شاعری

7.3.1 مولانا الطاف حسین حالی کا تعارف

خواجہ الطاف حسین حالی کی پیدائش 1837 میں پانی پت میں ہوئی۔حالی اپنے والد خواجہ ایزد بخش کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔والدین ان کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے لہذا ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی بہنوں نے ادا کی۔ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔قرآن شریف بھی کم عمری میں پانی پت کے مشہور قاری حافظ ممتاز حسین کی نگرانی میں حفظ کرلیا۔

ابھی سترہ برس کے ہی تھے کہ ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن اسلام النسا سے کردی گئی۔جن سے ان کی چھ اولادیں ہوئیں جن میں سے تین اخلاق حسین، سجاد حسین اور عنایت فاطمہ ہی بچ سکیں۔ شادی تو ہوگئی مگر حالی کا دل تعلیم کی طرف مائل تھا۔گھر والوں کی مرضی کے سامنے سر تو جھکا دیا مگر کچھ دن بعد ہی کسی کو اطلاع دیے بنا بے ساز وسامان اکیلے ہی دلی کی جانب روانہ ہوگئے۔راستے کی صعوبتیں جھیلتے آخر کار اس طرح دلی پہنچے کہ نہ ہاتھ میں پیسہ اور نہ ہی شہر میں کوئی شناسا۔

یہاں پہنچ کر کسی نہ کسی طرح جامع مسجد کے قریب مدرسہ حسین بخش میں مولوی نوازش علی کی شاگردی اختیار کی۔طالب علمی کا یہ زمانہ نہایت کسمپرسی میں گزرا۔جامع مسجد سے کچھ دور اجمیری گیٹ کے پاس ''اینگلو عربک مدرسہ'' قائم ہو چکا تھا جہاں انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی مگر استاد مولوی نوازش علی اس زمانے کے عام خیال کے مطابق انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔لہٰذا حالی کی رسائی اس مدرسے تک نہ ہوسکی۔مگر بعد میں انگریزی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی مدد سے انھوں نے انگریزی ادب سے واقفیت حاصل کرلی۔

اس زمانے میں ان کی ملاقات اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی۔ حالی نے غالب کی سوانح ''یادگارِ غالب'' کے عنوان سے لکھی جس کی بہت شہرت ہوئی۔ شعر گوئی کا آغاز بھی دلی میں ہی ہوا۔ پہلے 'خستہ' تخلص کیا اور اپنا کلام غالب کو دکھایا۔ غالب نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ کچھ دن بعد تخلص بدل کر حالی کر لیا۔

ڈیڑھ سال دلی میں گزارنے کے بعد بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کے حکم پر پانی پت لوٹ آئے مگر تعلیم کا جو سلسلہ دلی میں شروع ہوا تھا وہ پانی پت میں بھی جاری رہا۔ گھریلو ذمہ داریوں کے پیشِ نظر 1856 میں حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک چھوٹی سی نوکری کر لی۔ اسی درمیان 1857 کی جنگ آزادی شروع ہوگئی اور حالی حصار چھوڑ کر مصائب جھیلتے، لٹتے پٹتے پھر سے پانی پت لوٹ آئے اور بہت مدت تک بیمار رہے۔

چار برس پانی پت میں گزارنے کے بعد حالی پھر سے دلی آئے جو جنگ آزادی کی نامی کے بعد اجڑ چکی تھی۔ یہاں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔ انھوں نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر کے جہانگیر آباد بلا لیا۔ حالی وہاں تقریباً آٹھ برس رہے 1869 میں ہی شیفتہ کے انتقال کے بعد انھیں پنجاب میں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت کی پیش کش ہوئی جہاں ان کا کام انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں پر نظر ثانی کرنا تھا۔ حالی نے وہ ملازمت قبول کر لی اور دلی چھوڑ کر لاہور چلے آئے۔ یہ ملازمت ان کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ترجمے کے ذریعے انگریزی ادب سے واقفیت نے انھیں ایک نیا انداز فکر دیا اور ادب کی مقصدیت کا احساس دلایا۔

ان ہی دنوں محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائڈ نے انجمنِ پنجاب میں نظم کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں شعرا سے کسی ایک عنوان پر نظمیں لکھنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ ان مشاعروں کو 'مناظمہ' کہا جاتا تھا۔ حالی نے ان مناظموں میں شرکت کی۔ یہاں پڑھی گئی نظموں میں مناظرہ رحم و انصاف، نشاطِ امید، حبِ وطن اور برکھارت بہت مشہور ہوئیں۔

لاہور میں چار سال گزارنے کے بعد حالی ایک بار پھر عربی کے استاد کی حیثیت سے اینگلو عربک اسکول، دہلی لوٹ آئے۔ وہ ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے کوئی راستہ تلاش کر رہے تھے کہ ان کی ملاقات سر سید احمد خاں سے ہوگئی۔ دونوں کا درد ایک ہی تھا اور دونوں کا مقصد

بھی ایک تھا۔قوم کو جہالت اور غربت سے نکالنا اور اس کو ایک نئی روشنی دکھانا۔سرسید نے حالی کو مشورہ دیا کہ انھیں اپنی شاعری سے قوم کو جگانے کا کام لینا چاہیے۔انھوں نے سرسید کے اخبار' تہذیب الاخلاق' کے مضامین لکھے مگران کا بڑا کارنامہ 'مسدس حالی' ہے جو 1879 میں شائع ہوا۔

اس بار دلی میں حالی بارہ برس رہے۔1878 میں جب ریاست حیدرآباد کے وزیر آصف جاہ نے 75 روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا تو حالی نے اسکول سے استعفیٰ دے دیا اور پانی پت لوٹ آئے یہاں اپنے آبائی مکان کی مرمت کرا کے اس میں منتقل ہوئے علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔1914 میں دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور 31 دسمبر 1914 کو 80 برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

حالی غالب سے بہت متاثر تھے 1869 میں غالب کی وفات پر حالی نے مرثیۂ غالب لکھا جو بہت مشہور ہوا۔خاص طور پر یہ شعر زبان زد خاص و عام ہوا

اک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا

انھوں نے یادگارِ غالب کے عنوان سے غالب کی سوانح عمری اور 1901 میں 1000 صفحات پر مشتمل حیات جاوید کے عنوان سے سرسید کی سوانح عمری لکھی۔اس کے سوا حیاتِ سعدی شیخ سعدی کی سوانح عمری بھی لکھی۔حالی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے اور ان کے حقوق کے لئے آواز اُٹھاتے تھے اس موضوع پر انھوں نے نظم و نثر بہت لکھا۔وہ کم عمری کی شادی کے خلاف اور بیواؤں کی دوسری شادی کے حق میں تھے۔انھیں برائیوں کے خلاف نیز عورتوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے ایک ناول مجالس النساء بھی تحریر کیا جس پر انھیں پنجاب حکومت سے انعام بھی ملا۔بعد میں اس کتاب کو اسکولی نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔مگران کی شہرت کا سب سے بڑا سبب مقدمہ شعر و شاعری ہے جو ان کے دیوان کا دیباچہ ہے۔بعد میں اس کی تنقیدی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر اسے با قاعدہ علاحدہ کتاب کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔مقدمہ شعر و شاعری میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ مختلف مثالوں اور حوالوں سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ غزل کی شاعری کے موضوعات اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔لہذا اب یہ روش بدلنی چاہیے اور نئے موضوعات اور اصناف کو شاعری میں جگہ ملنی چاہیے۔یہ کتاب اردو میں تنقید کی پہلی با قاعدہ کتاب کہی جاتی ہے۔1904 میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا۔یوں تو انھوں نے غزل، مثنوی، مرثیہ،

قصیدہ، رباعی، قطعہ سبھی اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی مگر ان کے مسدس 'مدوجزر اسلام' نے جو شہرت پائی وہ ان کی کسی اور نظم کو میسر نہ آئی۔ اسی لئے یہ مسدّس، مسدّسِ حالی کے نام سے بھی جانی جاتی ہے جس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سرسید نے اس مسدّس کو پڑھ کر کہا تھا

''جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوالایا''

حالی نے اپنی نظم ونثر سے سماج کی اصلاح کا کام لیا۔ انھوں نے اپنی قلم کو عوام کی بیداری کے لئے استعمال کیا اور اردو میں مقصدی ادب کی راہ ہموار کی۔

7.3.2 مولانا حالی کی شاعرانہ فکر

مروجہ شاعری کے تعلق سے حالی کے نظریات انقلابی نوعیت کے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت کے دوران مغربی ادب کے تراجم کے مطالعے نے ان کو جو وسعت نظر بخشی اس کا ظہار ان کی معرکتہ الآرا تصنیف مقدمۂ شعروشاعری میں کیا گیا ہے یہ کتاب دراصل ان کے شاعری کے دیوان کا مقدمہ ہے جسے بعد میں ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اسے اردو کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اس مقدمے میں حالی نے نہ صرف روایتی شاعری کی خامیوں کی نشاندہی کی بلکہ عصری شاعری میں نئی زندگی کی روح پھونکنے کے لیے کچھ اصول بھی وضع کیے۔ انھوں نے قدیم مشرقی اور مغربی ادبی سرمائے کی مثالیں پیش کر کے شعراء کو ان سے استفادے کی تلقین کی۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری میں نئے اسلوب کی راہ ہموار کرنے کے ساتھ قدما کے ذخیرۂ الفاظ سے بھی استفادہ کیا جائے مگر ان کی تقلید نہ ہو۔ اس میں سادگی، سچائی اور دردمندی ہو۔ ان کے غزلیہ کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور ان کی جوانی کا ہے جس میں انھوں نے غالب اور شیفتہ کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھایا مگر اس دور کے کلام پر رندی اور حسن وعشق کے موضوعات کا گہرا اثر ہے۔ یہ کلام تقلیدی اور روایتی نوعیت کا ہے۔

دوسرا دور جدید رنگ لیے ہوئے ہے جس میں مقصدیت، اخلاق، پند و نصائح اور اصلاح کا رنگ غالب ہے اور یہی رنگ ان کی بنیادی شناخت ہے حالانکہ اس کے سبب ان کی غزلیات میں ایک قسم کا پھیکا پن محسوس ہوتا ہے۔

تیسرا دور تنقید حیات سے عبارت ہے۔ کیونکہ مبالغے کو ان کی شاعری میں راہ نہیں ملتی اس لیے تخلیقی وفور کی وہ شدت نظر نہیں آتی جو غزل کو دوام بخشتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری ان کی شخصیت کی بنیادی شناخت ہے بھی نہیں۔ لہذا موضوعات اور لفظیات دونوں میں ہی اس انوکھے پن کا فقدان ہے جس کی تلقین وہ دوسرے شعرا کو کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے کچھ شعر تغزل کی چاشنی سے معمور ہیں۔ مثلاً

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — جی چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخم جگر کہاں
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں میں

یوں تو حالی نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت کا سبب ان کی نظم گوئی ہے۔ حالی ایک مفکر اور مصلح تھے۔ ان کے پیشِ نظر سماجی اصلاح تھی۔ سرسید کی صحبت نے اس کو مزید جِلا بخشی۔ غالب جیسے نابغۂ روزگار کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ غزل کا ایجاز نئے سماجی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ نظم میں یہ گنجائش ہے کہ اس میں اصلاحی موضوعات کو پیش کیا جا سکے۔ غزل کے فارسی مزاج اور ذخیرۂ الفاظ کے بجائے انھوں نے اپنی نظموں میں ہندوستانی رنگ کو اپنایا۔

محمد حسن نے ان کے بارے میں کہا ہے

''ادبی اعتبار سے ان کی نظموں کا کارنامہ یہ ہے کہ کہ انھوں نے شاعری کی غیر ضروری حد بندیاں توڑیں اسے ہر قسم کے افکار و مسائل اور جذبات و احساسات کی آماجگاہ بنایا''

7.3.3 مولانا حالی کی شعری خصوصیات

حالی نے نئی شاعری کے جو اصول و ضوابط مقدمہ شعر و شاعری میں متعین کئے اس کا اطلاق دراصل ان کی نظمیہ شاعری پر ہوا۔ ان کی نظمیں سادگی سچائی اور اخلاص کی آئینہ دار ہیں۔ جن میں اس

مقصدیت کا عنصر حاوی ہے جس کا تقاضا وہ اپنے ہم عصروں سے کرتے ہیں اور جس کی بہترین مثال چپ کی داد اور مناجاتِ بیوہ جیسی نظمیں ہیں۔ زبان کے اعتبار سے اپنی نظموں میں انھوں نے عام فہم اور سادہ الفاظ استعمال اور عام بول چال کی زبان کو استعمال کیا ہے ہندی اور سنسکرت کے عام فہم اور اردو کے مزاج سے ہم آہنگ الفاظ ان کی نظموں میں بے ساختہ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

اسی طرح موضوعات کے اعتبار سے بھی ان کے یہاں اصلاحی پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے جس میں قومی اور ملی عناصر غالب ہیں ۔ اس کے علاوہ مناظرِ فطرت، فلسفیانہ وحکیمانہ مضامین، سماجی موضوعات اور عورتوں کے جذبات واحساسات کی تصویر کشی سادہ زبان میں کی گئی ہے۔ قومی یک جہتی جیسے موضوعات کو انھوں نے خصوصاً اپنی نظموں میں جگہ دی۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد

خورشید الاسلام نے درست کہا ہے کہ ''حالی نے اردو ادب کو نظم کی شکل میں ایک نئی صنف سخن دی ہے''

7.3.4 منتخب نظموں کی تشریحات

I مرثیۂ دہلی مرحوم

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستان گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا کہیں نہ اتنا خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے — اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ آنا ہرگز
آخری دور میں بھی تجکو قسم ہے ساقی — بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں — نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
یاں سے رخصت ہوسویرے کہیں اے عیش ونشاط — نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو — یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق — اب نہ دکھائے گا یہ شکلیں زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کردیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اوربزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی — ہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

تشریح

'مرثیہ دہلی' کے عنوان سے لکھی گئی یہ نظم قطع کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ نقطۂ اتکاز دلی کا تابناک ماضی اوراس کی تباہی ہے۔نظم کی ہیت ہونے کے باوجود تمام اشعار اپنے آپ میں مکمل ہیں جو اس قطعے کے حسنِ بیان میں اضافہ کرتے ہیں۔برخلاف غزل کے نظم کے اشعار کی تشریح ان کی کلیت میں ہوتی ہے۔پیشِ نظر نظم حالی کے نظریۂ مقصدیت کی مظہر ہے جس کے ذریعے وہ دلی کے پُرشکوہ ماضی،صاحبانِ علم کی صحبتوں کو یاد کر کے افسردہ ہیں۔

اگلے وقتوں کی دلّی کا ذکر جب کوئی دوست چھیڑتا ہے تو دل درد سے ایسا بھر آتا ہے کہ وہ خوبصورت کہانی سُنی نہیں جاتی۔اسی لئے شاعر راوی کو یہ کہہ کر روکتے ہیں کہ ہم یہ فسانہ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔عالم میں انتخاب یہ شہر جو کبھی بارونق تھا آج اُجڑ چکا ہے۔اس موسم خزاں میں گُل کا ذکر ہمیں رلا دیتا ہے۔تو یہ ذکر کر کے ہمارے دل پر ظلم کرتا ہے۔

دلّی کو باغ کے پھول سے تشبیہ دی گئی جس پر خزاں آ چکی ہے اسی مناسبت سے داستان سنانے والے کو بلبل کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔

رعایتِ لفظی: نظم کے ان مصرعوں میں گُل کی رعایت سے ہنسنا دراصل رعایتِ لفظی ہے جو کلام میں کسی ایک لفظ کی مناسبت سے کسی دوسرے لفظ کو لائے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

مراۃ انظیر: گُل، خزاں بلبل، اور ہنسنا ان سب کا ایک دوسرے سے ایک تعلق ہے مگر یہ تعلق تضاد یا تشبیہ کا نہیں ہے۔ کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال مراۃ انظیر کہلاتا ہے۔

دل رونے کے بہانے ڈھونڈتا ہے اس لئے گانے والا کوئی درد انگیز غزل نہ گائے جو دل کی بے قراری کو بڑھا دے۔ مصور کی ماضی کی دل چسپ اور رنگین تصویریں نہ دکھائے یہ تصویریں ہمیں گزری ہوئی صحبتوں اور دوستوں کی محفلوں کی یاد دلاتی ہیں۔ اے آنکھ ہمارے دل میں خون کے دریا کی موجیں ہیں۔ اس دریا کو آنکھ کے راستے ہی بہنا ہے اس لئے تو اس سے آنکھ نہ چرانا۔ دل کے دکھ کو خون کے دریا سے تشبیہ دی ہے۔ دل کا درد آنکھ کے راستے بہتا ہے اس لئے آنکھ کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اس سے آنکھ نہ چرانا۔ آنکھ چرانا محاورہ بھی ہے جس کے معنی ہیں کسی سے بچنا یا کسی کو نظر انداز کرنا۔ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانے کتنی یادیں دفن ہیں، اے سیاح ان کی جانب نہ جانا کہ انھیں دیکھ کر تیرے سینے پر داغ پڑ جائیں گے۔ دراصل یہاں داغ سے مراد دکھ کا احساس ہے۔

ان کھنڈروں میں ہر طرف کوئی نہ کوئی بڑی ہستی دفن ہے۔ اس مٹّی میں ایسے ایسے لوگ سوئے ہوئے ہیں جو اپنے آپ میں یکتا تھے جن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایسے قیمتی خزانے کہیں اور نہ ملیں گے۔ موتیوں کا خاک میں رُلنا استعارے کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو اس شعر کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ موتی کیونکہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے اگر وہ خاک میں پڑا ہو تو اس کی چمک اس مٹی میں گم ہو جاتی ہے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہاں صاحبان علم و فن کے لیے موتی کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

اے آسمان اب تو یہ حالت ہوئی کہ تو نے جن ہستیوں کو مٹایا اب تو اس کے نشان بھی مٹ گئے یعنی جو ظلم قسمت نے کیا اس کے ثبوت بھی ختم ہوئے اب سے زیادہ اور کوئی ظلم نہ کرنا۔

یہ عجیب صورتحال ہوئی ہے کہ جو ہمیں بھولے تھے اب ہم بھی انھیں بھولنے لگے ہیں۔ وقت اس طرح بدلا ہے کہ گئے دنوں کی یاد بھی دلوں سے مٹنے لگی ہے۔

دلّی کی تباہی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شہر میں کوئی ایسا خاندان نہیں کہ جس پر حادثوں کے زخم نہ لگے ہو۔ صرف افراد ہی نہیں پورے پورے کنبے زوال کی زد میں آئے ہیں۔

اے آسمان تو نے ہمیں مصائب میں مبتلا کر کے رُلا دیا ہم یہ بھی برداشت کر لیں گے مگر ہماری مصیبتوں پہ غیر ہنسیں ایسا ظلم نہ کرنا یہاں غیر سے مراد دشمن ہیں۔

دوست ان حالات پہ خود کیا روئیں گے ان پر تو ساری دنیا روتی ہے۔ تم ان کے ہنستے ہوئے چہروں پہ نہ جانا وہ اگر چہ روتے نظر نہیں آتے مگر اندر ہی اندر روتے ہیں۔

اے ساقی تو نے جو شراب دوسروں کو دی اور ہمیں محروم رکھا۔ تجھے قسم ہے بچی کھچی مَے جو ترے پاس ہے اب اسے بھی ہمارے پیالے میں نہ ڈالنا۔ ساقی دینے والے کا استعارہ ہے۔ یعنی جب تو نے سارے کرم اور عنایتیں دوسروں پر کیں تو اب ہم محروموں کی طرف نظر نہ کر۔ اب ہمیں تیرے کرم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی بے زاری اور بے کیفی کی حالت ہوتی ہے جس میں انسان مایوس ہو کر امیدیں چھوڑ دیتا ہے۔

اے زمانے قسمتیں اس انتظار میں جاگتی رہیں کہ کبھی ہم پر بھی نظر کرم ہوگی مگر یہ انتظار کبھی ختم نہ ہوا اور نصیب تھک کے سو گئے۔ نصیب یا قسمت کا سو جانا بدنصیبی کا اشارہ ہے۔ بہتر یہی ہے جو نصیب سو گئے ہیں نھیں نہ جگایا جائے۔ یعنی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اے عیش و نشاط اب یہاں سے رخصت ہو کہ صبح ہوگئی اور محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس جگہ عیش و نشاط کی کوئی گنجائش نہیں۔ محفلیں اکثر رات کو جمتی ہیں صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہیں اسی لیے محفل کے ساتھ رات کا صبح کے ساتھ محفل کے اُجڑنے کا ذکر ہوتا ہے۔

اے علم و ہنر کبھی یہ شہر دلی تمھارا گھر تھا۔ یعنی یہ اہل علم و ہنر کی قدر اور سرپرستی کرتا تھا۔ یہاں علم و ہنر کو وجود تصور کر کے ان سے مخاطب ہیں کہا ہے کہ دلی کو بھول بھی جاؤ تو اس شہر کو نہ بھولنا۔ یہ ایک طرح

سے دعا ہے کہ علم و ہنر دلی سے کبھی رخصت نہ ہو۔ اس شہر دلّی میں شاعری مر چکی اور جو مر جائے وہ کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہوتا۔ اس کی یاد کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھنا اور اس زمانے کو کبھی نہ بھولنا۔

یہ وہ شہر ہے جہاں اسداللہ خاں غالب، مصطفےٰ خاں شیفتہ، ضیاالدین نیرّ، مفتی صدرالدین آزردہ اور شیخ ابراہیم ذوق جیسے ادیب و فنکار بستے تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ یہ تمام نام دلّی کی شان تھے جن سے دلّی کی پہچان تھی مگر اب یہ سب ملکِ عدم کو روانہ ہوئے۔ اب کوئی ان کی شکل نہ دیکھ پائے گا۔ مومن خاں مومن، عبداللہ علوی، امام بخش صہبائی، نظام الدین ممنون جیسے صاحبِ علم اب اس شہر کو نصیب نہ ہوں گے نہ ہی ان کے جیسا شعر گو دوبارہ پیدا ہوگا۔

وہ جو اپنے آپ میں یگانہ یعنی ایک ہی تھے جن کے جیسا کوئی دوسرا نہ تھا ان کی موت نے ہم کو بھی سب سے منفرد کر دیا ورنہ ہم بھی ایسے کوئی منفرد نہ تھے جس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو۔ ان خاص لوگوں کی موت نے ہمیں عام لوگوں سے خاص کر دیا۔

مرزا داغ دہلوی اور میر مہدی مجروح ابھی باقی ہیں ان کی باتیں سن لیجیے کہ یہ بلبلوں کے ترانے بھی کُچھ ہی دن کے ہیں۔ داغ اور مجروح کو بلبل سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح بلبل چہچہانے سے گلشن کی رونق ہوتی ہے اسی طرح ان کی شاعری سے دلی کی تھوڑی سی رونق باقی ہے۔

اب چل چلاؤ کا وقت ہے ادب کی یہ محفل بس اُجڑنے کو ہے۔ یہ رونقیں اب دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ پرانی شاعری میں بزم کے سجنے کا تصور رات کے ساتھ جڑا تھا۔ زیر زبر ہو جانا، مٹ جانا یا ختم ہو جانا۔ اس جگہ پر رونق محفل جو رات کو سجی تھی وہ رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم ہوئی۔ حالانکہ رات کو عام طور پر منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے مگر حالی نے یہاں اسے محفل کے ساتھ استعمال کر کے اس کو مثبت معنی دے دیے ہیں۔

نظم کا اختتامی شعر شعر و ادب کے ایک بھرپور عہد کے خاتمے کا اعلان ہے جو اب کبھی پلٹ کر نہ آئے گا مگر پھر بھی اس بزم کو ماتم کی بزم کہنے کے بجائے شاعری کی بزم کہہ کر تلقین کر رہے ہیں کہ محفل سخن میں رونا رُلانا مناسب نہیں اس لئے خود رو کے دوسروں کو ہرگز نہ رُلانا۔

II برکھارُت

گرمی کی تپش بجھانے والی سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان عارف کے لئے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی وہ مؤر و مَلَخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سِوا تھا ریگ صحرا اور کھوَل رہا تھاآب دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سست گھڑیال تھے رود بار میں سست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس و دانہ تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا اور اُنس نکل رہا تھا سب کا
طوفان تھے آندھیوں کے برپا اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے شعلے تھے زمیں سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام تھا آگ کا نام مفت بدنام

رستوں میں سوار اور پیدل سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل
گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی وہ بادِ سموم سے سِوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درونی لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹّی میں تھا دن گنواتا کوئی تہہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سنسان آتی تھی نظر نہ شکل انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کُچھ اگر تھا یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحطِ آدمی زاد سلطان کااک کنواں تھا آباد
پانی سے تھی سب کی زندگانی میلہ تھا وہیں پہ جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوت پاتے تھے دل و جگر طراوت
کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی بھر آتا تھا سن کے منھ میں پانی
تھے جوخفقانی اور مراقی گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا انھیں مزا کُچھ آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کُچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے
اور صبح سے شام تک برابر تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو ہونٹوں پہ پھیرتے تھے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لا کر پھر چھوڑتے نہ تھے منھ لگا کر
بچے ہی نہ تھے پیاس سے مضطر تھا بڑوں کا حال ان سے بد تر
تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پروا کی دہائی پھر رہی ہے پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رِسالے گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سے چھاتی اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑ چلتی چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینھ کا ہے زمین پر ڈریڑا گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں جنّت کی ہوائیں آرہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے منھ پر اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسل صحت کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا ہے تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھ جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیَر پانی میں مگر کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھِر کے آسما ں پر کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ یا ربّ لنا و لا علینا
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

ہیں شکر گزار تیرے برسات انسان سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری سب دیکھ رہے ہیں راہ تیری
تجھ سے کھلا یہ رازِ قدرت راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

شکریہ فیضِ عام تیرا پیشانیٔ دہر پر ہے لکھا
گلشن کو دیا جمال تونے کھیتی کو کیا نہال تونے
طاؤس کو ناچنا بتایا کوئل کو الاپنا سکھایا
جب مور ہے ناچنے پہ آتا آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا
کوئل کو نہیں قرار اِک پل ایسی کوئی تو نے کوک دی کل
شب بھر میں ہوا سماں دگر گوں کیا پڑھ دیا آکے تو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
دریا تجھ بن سسک رہے تھے اور بَن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی
جو دانے تھے خاک میں پریشان سب آکے چڑھائے تو نے پروان
دولت جو زمین میں تھی مخفی آگے ترے اُس نے سب اُگل دی
پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر واں سبزہ و گل ہیں جلوہ گُستر
جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پر انبار ہیں بیر بہوٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کُچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کمسِن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملہار گاتی اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندّی نالے چڑھے ہوئے ہیں تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گُھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی اور تیَر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندّیوں کے دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی موجوں کی ہیں صورتیں ڈراؤنی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاّحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رَو زور پر ہے مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

بیزار اک اپنے جان و تن سے بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوارہے کوئی اور نہ دل جو اک باغ میں ہے پڑا لب جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھّا اور رنگ سا کُچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے پیہم اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
اے چشمۂ آبِ زندگانی گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری بستی ہے اسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو دیتا ہوں میں بیچ میں خداکو
اوّل کہیو سلام میرا پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھّا فرقت میں تمھاری آئی برکھا
آتاہے تمھارا دھیان جس دم مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یوں ہی صبح شام اکثر تالاب میں تیرتے تھے جاکر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یوں ہی ہاتھ میں دیے ہات پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑسے آم ہے ٹپکتا میں تُم کو ادھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار
تُم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی پر جی میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد جب جی میں‌بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی فریاد یہ درد ناک اُس کی
تھا سوز میں کُچھ ملا ہوا ساز پکڑا دل سُن اُس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر روڑا ہے یہ کہاں کا مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

تشریح

یہ طویل نظم پانچ حصّوں پر مشتمل ہے ہر حصے میں ایک خاص ماحول کا بیان ہے۔ پہلا حصہ برسات کی آمد سے قبل حبس اور گرمی کی شدت کو بیان کرتا ہے۔

گرمی کی تپش بجھانے والی۔۔۔۔۔۔۔۔

نظم کے ابتدائی اشعار تمہیدی رنگ میں اور موسم برسات کی تعریف میں ہیں۔ برسات کے بعد سردی کا موسم آتا ہے ہے اس لیے کہا جا رہا ہے کہ یہ موسم گرمی کی شدت کو کم کرتا ہے سردی کی آمد کا اعلان ہوتا ہے یہ قدرت کا ایک عجیب وغریب خزانہ ہے۔ عارفوں یعنی حقیقت کا علم رکھنے والے لوگوں کے لئے یہ علم وآگہی کی کتاب ہے۔ اس موسم میں پیڑ پودے سرسبز ہو جاتے ہیں چیونٹیاں اور ٹڈیّاں تک اس موسم سے زندگی پاتی ہیں۔ برسات، سال کے تمام موسموں کی جان ہے۔ جو بہت دعاؤں اور التجاؤں کے بعد آتی ہے۔ اس کے آنے سے گرمی سے بے حال مخلوق کی جان میں جان آجاتی ہے۔

ان تمہیدی اشعار کے بعد گرمی کی شدت اور اس کے اثرات کا بیان ہے۔ گرمی سے ہر جان دار یہاں تک کہ پہاڑ بھی تپ رہے تھے۔ ریگستان کی ریت گرم راکھ سے زیادہ گرم تھی اور دریاؤں کا پانی کھوَل رہا تھا۔ جنگل اور باغ لُٹے پٹے، اُجاڑ نظر آرہے تھے۔ سانڈے اپنے بلوں میں دُبکے پڑے تھے اور جانور گرمی سے ہانپ رہے تھے۔ لو کا یہ عالم تھا لومڑیوں کی زبان پیاس کی شدّت سے باہر نکل آئی تھی اور ہرنوں کا رنگ دھوپ سے کالا پڑ گیا تھا۔ چیتے گرمی سے ایسے بے حال تھے کہ انھیں شکار کا خیال ہی نہیں آرہا تھا۔ ہرن جو ہمیشہ ایک قطار میں چلتے ہیں وہ بھی سایے کی تلاش میں اپنی قطار سے باہر نکل رہے تھے۔ شیر اپنی کچھار میں اور مگر مچھ پانی کے اندر سُست پڑے تھے۔ سواری کے جانوروں کی حالت خراب تھی اور بیلوں نے کندھا ڈال دیا تھا۔ کندھا ڈالنے کا معنی تھکا ہونا کام کے قابل نہ رہ جانا ہے گرمی کا یہ عالم تھا کہ اگر بدن کو کاٹا جاتا اس سے خون نہ نکلتا یعنی بدن کا خون تک سوکھ گیا تھا اور گایوں کے تھنوں میں دودھ سوکھ گیا تھا۔

'کاٹو تو لہو نہ تھا بدن' میں ضرب المثل ہے۔ جس کے معنی خوف کے سبب خون سوکھ جانے کے ہیں مگر یہاں گرمی کے سبب خون سوکھ جانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ایسے جملے یا باتیں جو مسلسل استعمال کی وجہ سے مثال بن جائیں، ضرب المثل کہلاتی ہیں۔

گرمی کی وجہ سے گھوڑوں نے دانہ پانی چھوڑ دیا تھا۔ان پر پیاس کی شدّت چابک کی طرح برس رہی تھی۔گرمی کے سبب بھپکے نکل رہے تھے سب کا آنس نکل رہا تھا۔لو کی آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ہر طرف دھول اس طرح اُڑ رہی تھی کہ بگولے پہ بگولے اُڑ رہے تھے۔دھول کا دائرے کی شکل میں اُڑنا بگولہ کہلاتا ہے۔ایسا لگتا تھا کہ زمین سے شعلے نکل رہے تھے اور بدن پہ گرم ہوا ایسی لگتی تھی جیسے آری چل رہی ہو۔آگ کو تو لوگ یونہی بدنام کرتے ہیں۔گرم ہوا میں ایسی تپش تھی جیسے بدن سے آگ لپٹ گئی ہو۔راستوں پر پیدل چلنے والے اور سواری میں بیٹھے ہوئے لوگ سبھی گرمی سے پریشان تھے۔گھوڑوں کو اگر کہیں کسی درخت کا سایہ بھی نظر آجاتا تو ان کے قدم وہیں رُک جاتے۔لوگ پانی کی آس میں آسمان کی طرف نگاہ لگائے تھے مگر آسمان سے پانی کی جگہ آگ برس رہی تھی۔ پنکھے سے نکلنے والی ہوا بھی بادسموم یعنی گرم لو جیسی لگتی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے جسم کے اندر بھی آگ لگی ہو۔ ہوا لگنے سے جلن کم ہونے کے بجائے تپش کا احساس دوگنا بڑھ جاتا تھا۔صبح سات آٹھ بجے سورج غروب ہونے تک سبھی جاندار دھوپ کی شدت سے پریشان رہتے تھے۔کوئی پورا دن خَس کے پردے میں چھپا رہتا۔کیونکہ تہہ خانوں میں گرمی اور لو کا احساس کم ہوتا ہے اس لئے جن کے گھروں میں تہہ خانے تھے وہ تہہ خانے میں دن گزارتے۔ بازار خریداروں سے خالی تھے اور دور دور تک انسان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔دکاندار جن کی دکانوں پہ خریداروں کی بھیڑ رہتی تھی وہ بھی خالی بیٹھے تھے۔اگر کہیں لوگوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی تو وہ یا تو سبیل اور پیاؤ تھا یا سلطان کا کنواں تھا۔سب کی زندگی پانی پہ ٹکی تھی۔ جہاں پانی تھا وہیں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ برف اور فالودہ جو گرمی کی خاص چیزیں ہیں سب کا دل انھیں پہ للچاتا تھا۔

ایسے موسم میں جب ہر شے گرمی سے جلی ہوئی ہو اگر کہیں پھول یا پھل نظر آجاتے تو ان کی تازگی دیکھ کر دل کو ٹھنڈک ملتی تھی۔سبزی بیچنے والوں کی آوازیں سُن کر منھ میں پانی بھر آتا تھا۔سبزی بیچنے والے اکثر ایسی دلچسپ آوازیں لگاتے ہیں جن کو سُن کر بے اختیار منھ میں پانی بھر آتا ہے۔جن لوگوں کو خفقان اور مراق کا مرَض تھا ان میں تو گرمی سے جان ہی باقی نہ رہ گئی تھی۔انھیں کھانے پینے کا کوئی مزہ نہ آتا تھا۔بھوک تقریباً ختم ہوگئی تھی۔رات ایڑیاں رگڑتے رگڑتے گزرتی غرض کسی نہ کسی طرح مرپیٹ کے صبح ہوتی۔

اس شعر میں دو محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ایڑیاں رگڑنا اور مر پیٹ کے کوئی کام کرنا، دونوں کے معنی کسی کام کو بہت مشکل سے کر پانا۔ کیونکہ گرمی کی شدت میں ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہوتا تھا اسی لئے کہا گیا کہ ایڑیاں رگڑ کے اور مر پیٹ کر رات گزرتی تھی۔ یہاں تک کے صبح شام تک زبان پر اُلعطش، یعنی پیاس کا ورد رہتا تھا۔

چھوٹے بچوں کا حال اس سے بھی بُرا تھا ان کے پھول جیسے نازک گال کمھلا گئے تھے بچوں کے گالوں کو نزاکت اور نرمی کے سبب پھول سے تشبیہ دی گئی جس طرح گرمی اور دھوپ سے پھول مرجھا جاتے ہیں اسی طرح بچوں کے گال بھی کمھلا گئے تھے۔ اور وہ پیاس کی شدت سے بے حال تھے۔ کیونکہ ابھی بولنا نہ سیکھا تھا اس لیے بار بار مم مم کہہ کر ہونٹوں پہ زبان پھیرتے اور ماں سے پانی مانگتے تھے۔ اور اگر کسی نے پانی دے دیا تو ایک بار ہونٹوں سے لگا کر چھوڑتے نہ تھے۔ یہاں حالی نے آنکھوں میں دم ہونے کے محاورے کے ساتھ بچوں کی زبان کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ پیاس کا یہ عالم بچّوں کے ہی نہ تھے بڑوں کی حالت اس سے بھی خراب تھی۔ بار بار پانی پینے کے باوجود کسی کی پیاس نہ بجھتی۔

گرمی کے اس بیان کے بعد نظم کا دوسرا اور اصل حصّہ شروع ہوتا ہے جس میں برسات کی آمد کا اعلان ہے۔

کل شام تک تو تھے یہی طور۔۔۔۔۔۔۔۔

اس حصے میں پہلا شعر تمہید کے طور پر کہا گیا ہے کہ کل رات گرمی کی یہی شدت جو بیان کی گئی مگر رات ہوتے ہوتے ماحول ہی بدل گیا۔ پُروا ہوا جو بارش سے پہلے چلتی ہے، چلنی شروع ہوئی۔ اور پھر برسات کا ڈنکا بجنے لگا۔ پُرانے زمانے میں کوئی اعلان کرنے سے پہلے ڈھول بجایا جاتا تھا جسے محاورے میں ڈنکا بجانا کہتے ہیں۔ کیونکہ بارش سے پہلے بادل کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑکڑاہٹ بھی ہوتی ہے اسی لئے اس کو ڈنکا بجنا کہا گیا ہے۔ اس کی آواز سے آسمان میں شور مچا ہوا ہے۔ برسات کی آمد کے اس منظر کو جنگ کے منظر سے اور اس کی لفظیات کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ جنگ سے پہلے بھی ڈنکا بجا کر جنگ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور جنگ میں شور اور آوازیں بھی تیز ہوتی ہیں۔

ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ابر گھِر کر آ رہا ہے جسے فوج سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور بادل کیونکہ کئی رنگ کے ہوتے ہیں اس لئے انھیں گورے کالے بادل کہا گیا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ گورے اور کالے اس زمانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ فرنگی حکومت کی فوج میں دو طرح کے دستے ہوتے تھے حالی نے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بادلوں کے ہلکے اور گہرے رنگوں کو خوبصورتی سے استعمال کر لیا ہے۔ اسی منظر کو مزید بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آسمان پر بادلوں کی چھاؤنی سی بن گئی کہ بادلوں کی ایک فوج آتی ہے اور ایک جاتی ہے۔ نہ جانے کس مہم پہ جا رہے ہیں کہ لاکھوں توپ خانے ساتھ ہیں۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز توپوں کی گڑگڑاہٹ سے ملتی ہے۔ اس گڑگڑاہٹ سے زمین کا سینہ ہل جاتا ہے۔

نظم کے یہ چھ اشعار جن میں برسات کے منظر کو فوج اور جنگ کی اصطلاحات کی مدد سے بیان کیا گیا ہے مراۃ النظیر کی بہترین مثال ہیں۔ جیسے ان اشعار میں ڈنکا، شور، فوج، دَل، رِسالے، چھاؤنی، توپ خانہ، یہ سب جنگ کی اصطلاحات ہیں جو اِن اشعار میں تسلسل کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں اس لئے مراۃ النظیر کہلائیں گی۔

جب زمین پر بارش کی تیز بوچھار پڑتی ہے تو گرمی کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے یعنی وہ غائب ہو جاتی ہے۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہو جاتا ہے مگر جیسے ہی بجلی چمکتی ہے آنکھوں کے سامنے روشنی آ جاتی ہے۔ گھٹاؤں کے ساتھ ٹھنڈی ہوا جنّت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر طرف جدھر نظر اُٹھایئے خدا کی قدرت کے نظارے ہیں۔ سورج نے اپنا چہرہ بادلوں کے پردے میں چھپا لیا ہے اور دھوپ غائب ہو گئی ہے۔

اسی ضمن میں جنگل کا احوال بیان کیا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ پہاڑ اور جنگل میں ہر طرف سبزہ بچھ گیا ہے۔ پگڈنڈی اور سڑک دونوں اس سبزے میں چھپ گئی ہیں اور راہ چلنے والے اندازے سے قدم اُٹھاتے ہیں۔ پیڑ اور پتّھر ایک ہی رنگ کے نظر آتے ہیں تمام عالم سبز ہو گیا ہے۔ پہاڑ اور درخت پھولوں سے دولھا کی طرح سجے ہیں۔ سارا جنگل جل تھل ہے۔ پپیہے اور مور کی آوازیں ہر طرف گونج رہی ہیں۔ کوئل کی میٹھی آواز دل کو لُبھاتی ہے۔ مینڈک نے اپنے شور سے آسمان سر پہ اُٹھا رکھا ہے۔ وہ مگر مچھ ہوں یا شیر، خدا کی نعمتوں کے دسترخوان سے سب فیضیاب ہو رہے ہیں۔ امیر غریب سب اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ ابر کو دیکھ کر ہر شخص خوش ہے۔ عبادت گزار مسجد میں خدا کا شکر ادا کر

رہے ہیں اور سب کی لیے خیر کی دعا مانگ رہے ہیں۔ مندر میں سب میگھ راج کے کرم کا گن گان کر رہے ہیں۔ گرنتھی اور کبیر کو ماننے والے بھی خدا کا شکرانہ ادا کر رہے ہیں۔ کوئی ملھار گا تا جا رہا ہے کوئی راگ دیس گنگنا رہا ہے۔ کوئی سرون گا رہا ہے کسی کے ہونٹوں پہ ہیر رانجھا ہے۔ جین مذہب کے ماننے والے بھی اس بات کا خیال رکھ رہے ہیں کہ ہر زندگی کی حفاظت ہو۔ کیونکہ برسات میں روشنی پر بہت پتنگے آتے ہیں اس لئے وہ چراغوں پہ ڈھکن رکھتے ہیں کہ کہیں ان کی لو سے کوئی پتنگا نہ جل جائے۔

ہیں شکر گزار تیرے برسات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار

اس حصے میں شاعر برسات کا شکر ادا کر رہا ہے جس کے سبب انسان اور غیر جاندار سب کو راحت ملی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ اسی برسات کی وجہ سے باغ خوبصورت اور کھیتیاں ہری بھری ہوگئیں۔ مور بے خود ہو کر ناچتا ہے اور کوئل مسلسل کوک رہی ہے۔ مور کو ناچنا اور کوئل کو کوکنا اسی موسم نے سکھایا۔

جب سوئے تھے تو اساڑھ تھا یعنی برسات، صبح جاگے تو ماگھ ہے۔ ماگھ دراصل سردی کے آغاز کا مہینہ ہوتا ہے۔ جس میں ہوا میں ہلکی سی خنکی شامل ہو جاتی ہے۔ برسات میں جب بارش زیادہ ہوتی ہے تب بھی ہوا میں خنکی محسوس ہوتی ہے۔ اسی خنکی کی مناسبت سے برسات کے موسم کو ماگھ کے مہینے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ موسم کی تبدیلی کی ایک اور مثال اگلے شعر میں یہ کہہ کر دی ہے کہ رات کو لاہور میں تھے اور دن ہوا تو کشمیر پہنچ گئے۔ لاہور گرم علاقہ ہے اور کشمیر ٹھنڈا۔ معنی یہ ہوئے رات کو سوئے تھے تو گرمی تھی اور دن نکلا تو بارش نے موسم کو ٹھنڈا کر دیا۔ ہوا میں امرت سا بھر گیا ہے۔ دریا خشک پڑے برسات کا انتظار کر رہے تھے بارش نے ان میں جان ڈال دی۔ جو جھیلیں سوکھ گئی تھیں آج یہ عالم ہے کہ ان کی تہہ اور گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ مٹی میں پڑے ہوئے دانے بھی بارش کا پانی پا کر پھوٹ آئے۔ یہ سب دولت جو زمین چھپی تھی یعنی ہریالی اور کھیتی، بارش کے پانی نے اسے سرسبز کر دیا۔ زمین سے اگنے والے اناج کو زمین کا سونا بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں کوڑا کچرا پڑا تھا اس کوڑے پر بھی پھول اور سبزہ اُگ آیا ہے۔ جن باغوں میں دھول اُڑتی تھی وہاں اب جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ بنجر زمین اس موسم کی بدولت زرخیز ہوگئی ہے۔ بیر بہوٹیوں سے ساری زمین ایسا لگتا ہے پھولوں سے بھر گئی ہے بیر بہوٹی ایک سرخ رنگ کا کیڑا ہوتا ہے۔ اور زمین پر پڑا پھول جیسا لگتا ہے۔

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

نظم کے چوتھے حصے میں نوجوانوں پر برسات کے اثر کا بیان ہے۔ باغوں میں ہر طرف کھمبے لگا کر جھولے ڈالے گئے ہیں۔لڑکیاں اور بچّیاں جن کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں وہ اپنی باری پہ جھولے جھول رہی ہیں اور خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔لڑکیوں کے جھولا جھولنے کے منظر کی جزیات کو حالی نے بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ لڑکیاں جب مل کر گیت گاتی ہیں تو ان کی آواز جنگل کو سر پہ اُٹھا لیتی ہیں۔

محاورہ: آسمان سر پہ اُٹھانا۔: تیز شور کرنا یا اونچی آواز میں بولنا

کبھی ایک سب کو جھلاتی ہے کوئی دوسری گرنے سے ڈر رہی ہے، کوئی ملھار گا رہی ہے کوئی جھولے کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔کوئی ہنڈولا گاتی ہے کوئی دیس ڈھولا گاتی ہے۔ان میں سے کوئی جب جھولے سے گرتی ہے باقی لڑکیاں قہقہہ لگا کے اس پہ ہنستی ہیں۔

دوسری جانب ندی نالوں میں پانی بھر جانے سے لڑکے بھی تیراکی کے مزے لے رہے ہیں۔کوئی ناؤ پہ سوار ہو کے ندی پار کرتا ہے اور کوئی تیر کر دوسرے کنارے پہنچتا ہے۔ بگلوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں تیرتے ہیں۔ پانی زیادہ آجانے کی وجہ سے ندیوں کے پاٹ اتنے چوڑے ہو گئے ہیں کہ کشتیوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچنے میں پورا دن لگ جاتا ہے۔ پانی کا زور اس قدر ہے کہ موجوں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔کشتیاں موجوں کے زور سے پانی میں ادھر اُدھر ڈگمگا رہی ہیں۔کشتی چلانے والے ملاح گھبرائے ہوئے ہیں کہ کشتی کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ پانی اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ مچھلی کو جس کی زندگی ہی پانی سے ہے اُسے بھی اپنی جان کا خطرہ ہو گیا ہے۔

بیزار اک اپنے جان وتن سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نکلا وہ ہمارا دوست حالی

نظم کے آخری حصے میں ایک ایسے شخص کا بیان ہے جو اس خوبصورت موسم میں پردیس میں ہے اور اپنے آپ سے بیزار ہے کہ ایسے موسم میں ہم وطنوں سے دور ہے۔ پردیس کی مصیبتیں جھلیتا ہوا تھکا ہارا اور تنہا جس کا نہ کوئی غم خوار نہ دل بہلانے والا ، باغ میں ایک نہر کے کنارے پڑا ،سفر کی پریشانیوں کو سوچ رہا ہے۔نہ آس پاس کی خبر نہ اپنے آپ کی۔اتنے میں ایک طرف سے ابر اُٹھتا ہے اور ہوا کا رنگ بدلتا ہے۔ مسلسل بجلی کڑکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پھوار پڑنے لگتی ہے۔اب جو ہوا

کے جھونکے آنے شروع ہوئے تو دل غم کو بھولنے لگا۔اور خوشگوار یادوں نے اس کو گھیر لیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہتے جاتے تھے اور کبھی کبھی خود ہی گنگنانے لگتا۔کبھی جوش میں آ کر یہ گانا گاتا کہ اے زندگی کے چشمے کے پانی تیری روانی کبھی ختم نہ ہو یعنی زندگی یونہی رواں دواں رہے اس میں کبھی کوئی کمی نہ آئے۔ یہاں زندگی کے پانی سے مراد برسات ہے۔وہ کہتا ہے جس طرف تیرا رخ اسی طرف ہماری بستی بھی ہے۔اگر کہیں میرے دوستوں سے ملاقات ہو تو تجھے خدا کا واسطہ ان سے پہلے میرا اسلام ضرور کہنا اور پھر ان کو میرا پیام پہنچانا کہ میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تم سے جدائی ہو برسات آئے۔مرغابیوں کو ساتھ تیرتے دیکھ کر میں تم دوستوں کو یاد کرتا ہوں۔ہم بھی اسی طرح صبح شام تالاب میں تیرا کرتے تھے۔ یہ پیڑ پودے ہوا سے لہلہاتے ہیں تو مجھے تمہاری صحبت یاد آتی ہے۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دن رات گھومتے تھے۔جب پیڑ سے آم ٹپکتے ہیں تو میری نظر تمہیں تلاش کرتی ہے۔مگر جب کوئی نظر نہیں آتا بہت بے بسی محسوس ہوتی ہے۔آم کا موسم ہو دوست میرے ساتھ نہ ہوں ایسے موسم سے دل خوش ہونے کے بجائے بیزار ہوتا ہے۔تمہارے بغیر بدن پہ پڑنے والی بارش کی بوندیں بھی چنگاری سی لگتی ہیں۔سرد ہوا بدن کو لگتی ہے تو دل سلگنے لگتا ہے۔جب دل میں اپنے دیس کی یاد بسی ہو خوشگوار موسم میں بھی دل خوش نہیں ہوتا۔اس مسافر کی یہ درد بھری فریاد دل میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔اس کے درد میں اور پُرسوز آواز میں ایسی نغمگی تھی کہ جسے سُننے والا دل پکڑ کر رہ جائے۔میں آخر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ کہاں کا روڑا ہے کس دیس کا باشندہ ہے۔اب جو غور سے دیکھا تو یہ تو ہمارے دوست حالی نکلے۔اس آخری شعر میں حالی نے اپنے آپ کو مسافر یا غریب الوطن تصور کر کے اس پردیسی کی اداسی اور تنہائی کی تصویر کشی کی ہے۔وطن کی محبت حالی کی نظموں کا ایک اہم پہلو رہا ہے اس نظم میں بھی برسات کا ذکر کرتے کرتے اپنے آپ کو پردیسی تصور کر کے اس پردیسی سے وطن کی محبت کا بیان کرواتے ہیں۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا

- حالی کے حالاتِ زندگی اور ادبی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی۔
- حالی کے شعری خصوصیات سے واقفیت حاصل کی۔
- حالی کی زبان اور شاعرانہ فکر سے واقفیت حاصل کی۔
- حالی کی نظموں کی تشریح اور اس زمانے میں رائج الفاظ کا علم ہوتا ہے۔
- حالی کی ادبی حیثیت اور ادب میں ان کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1 حالی کا پورا نام اور تاریخ پیدائش و وفات بیان کیجیے؟
2 حالی کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے؟
3 حالی کی نظم مرثیۂ دہلی کی ہیئت متعین کیجیے؟
4 مرثیۂ دہلی کا مرکزی خیال کیا ہے بیان کیجیے؟
5 برکھارت کا مرکزی خیال بیان کیجیے؟
6 برکھارت کے کسی ایک حصے کی تشریح کیجیے؟

7.6 سوالات کے جوابات

1 حالی کا پورا نام خواجہ الطاف حسین ہے۔ حالی کی پیدائش 1837 میں پانی پت میں ہوئی اور 31 دسمبر 1914 کو انتقال ہوا۔

2 حالی کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ان کی سادگی ہے۔اپنی نظموں کے ذریعے انھوں نے سماج کی اصلاح کا کام کیا۔وطن سے محبت کے جذبے کو فروغ دیا۔ان کی نظمیں آسان اور مقصدیت سے بھرپور ہیں۔ ہندی اور سنسکرت کے سادہ اور آسان الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ غزل کی شاعری کے موضوعات پرانے ہو چکے ہیں اس لیے اب انھیں بدلنا چاہیے اور اس کی جگہ نئی اصناف اور موضوعات کو اختیار کرنا چاہیے۔اپنی شاعری میں انھوں نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔مدوجزر اسلام یا مسدسِ حالی ان کی مقصدی اصلاحی شاعری کی مثال ہے۔

3 مرثیہ دہلی ایک طویل قطعہ ہے۔جس کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے تمام اشعار اپنے آپ میں بھی مکمل ہیں۔

4 جیسا کہ نظم کے عنوان سے ہی مترشح ہوتا ہے کہ مرثیۂ دہلی کا پس منظر دلی کی تباہی ہے۔وہ دلی جو کبھی علم و ہنر کا مرکز کہلاتی تھی اور جس سے حالی کو ایک جذباتی وابستگی تھی اس کی تباہی ان کے دل کو بے طرح متاثر کرتی ہے۔اس کی گلیاں، اس کے منظر اس کے ادیب و شاعر، ایک سے ایک دانا و صاحب حکمت جس سے دلی کی گلیاں آباد تھیں اور جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں سپردِ خاک ہوئے یہ نظم ان ہستیوں اور منظروں کی نوحہ خوانی ہے۔

5 برکھارُت میں موسم برسات کا تفصیلی ذکر ہے جس میں گرمی شدت کا بیان کرتے ہوئے

برسات کی آمد کے ساتھ آسمان وزمین کے ساتھ نباتات و جمادات، انسان وحیوان اور چرند پرند غرض تمام کائنات پر برسات کے اثر کا بیان بہت سادہ مگر تفصیلی انداز میں کیا گیا ہے۔ حالی نے یہ انجمنِ پنجاب کے مشاعرے میں پڑھی تھی اور داد حاصل کی تھی۔ اس کے سہل انداز اور عام فہم زبان نے اُردو نظم پر ہندی کے آسان اور مانوس الفاظ کے استعمال کی راہ ہموار کی۔

6 ہیں شکر گزار تیرے برسات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار

اس حصے میں شاعر برسات کا شکر ادا کر رہا ہے جس کے سبب انسان سے غیر جاندار سب کو راحت ملی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ اسی برسات کی وجہ سے باغ خوبصورت اور کھیتیاں ہری بھری ہوگئیں۔ مور بے خود ہو کر ناچتا ہے اور کوئل مسلسل کوک رہی ہے۔ مور کو ناچنا اور کوئل کو کوکنا اسی موسم نے سکھایا۔

جب سوئے تھے تو اساڑھ تھا یعنی برسات، صبح جاگے تو ماگھ ہے۔ ماگھ دراصل سردی کے آغاز کا مہینہ ہوتا ہے۔ جس میں ہوا میں ہلکی سی خنکی شامل ہو جاتی ہے۔ برسات میں جب بارش زیادہ ہوتی ہے تب بھی ہوا میں خنکی محسوس ہوتی ہے۔ اسی خنکی کی مناسبت سے برسات کے موسم کو ماگھ کے مہینے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ موسم کی تبدیلی کی ایک اور مثال اگلے شعر میں یہ کہہ کر دی ہے۔ رات کو لاہور میں تھے اور دن ہوا تو کشمیر پہنچ گئے۔ لاہور گرم علاقہ ہے اور کشمیر ٹھنڈا۔ معنی یہ ہوئے کہ رات کو سوئے تھے تو گرمی تھی اور دن نکلا تو بارش نے موسم کو ٹھنڈا کر دیا۔ ہوا میں امرت سا بھر گیا ہے۔ دریا خشک پڑے برسات کا انتظار کر رہے تھے برسات نے ان میں جان ڈال دی۔ جو جھیلیں سوکھ گئی تھیں آج یہ عالم ہے کہ ان کی تہہ کا پتا نہیں چلتا۔ مٹی میں پڑے ہوئے دانے بھی بارش کا پانی پا کر پھوٹ آئے۔ یہ سب دولت جو زمین میں چھپی تھی یعنی ہریالی اور کھیتی، بارش کے پانی نے اسے سرسبز کر دیا۔ زمین سے اگنے والے اناج کو زمین کا سونا بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں کوڑا کچرا پڑا تھا اس کوڑے پر بھی پھول اور سبزہ اُگ آیا ہے۔ جن باغوں میں بگولے اُڑتے تھے وہاں اب جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ بنجر زمین اس موسم کی بدولت زرخیز ہوگئی ہے۔ بیر بہوٹیوں سے ساری زمین ایسا لگتا ہے پھولوں سے بھر گئی ہے بیر بہوٹی ایک سرخ رنگ کا کیڑا ہوتا ہے اور زمین پر پڑا پھول جیسا لگتا ہے۔

7.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
دلِ شوریدہ	پریشان دل
مطرب	گانے والا
مصوّر	تصویر بنانے والا
مرقّع	تصویروں کی کتاب، البم
موَج زَن	موجیں لیتا ہوا
گوہر یکتا	قیمتی موتی
تہہِ خاک	مٹّی میں دفن
حوادِث	مصیبتیں
چرَخ	آسمان
بخت	قسمت
عجائبات	عجیب چیزیں
کان	خزانہ
عارف	حقیقت کو جاننے والا
کتابِ عرفان	آگہی کی کتاب
مؤر	چیونٹی
مَلَخ	ٹڈی
ریگِ صحرا	ریگستان کی ریت
سانڈا	چھپکلی کی قسم کا ایک جانور جو ریت میں رہتا ہے
چارپائے	چار پیروں پر چلنے والے جانور
رؤدبار	پانی کی جگہ
تازیانہ	چابک
بگولہ	دائرے کی شکل میں گھومتی ہوئی دھول

بےکل	بے چین
رُوکھ	پیڑ
بادِسموم	گرم ہوا، لو
سِوا	زیادہ
سلطان کا کنواں	لاہور کا ایک مشہور علاقہ جس کے کنویں کا پانی بہت میٹھا تھا
خفقان	ایک مرض جس میں دل بہت دھڑکتا ہے
مراق	ایک مرض جس کا اثر دماغ پر ہوتا ہے
العطش	پیاس
مضطر	پریشان
رِسالے	دستے
دریڑا	بوچھار
معمور	بھرا ہوا
لاجوردی	سبزی مائل نیلا رنگ
اشجار	درخت
یاربّ لنا ولا علینا	اے اللہ ہم سب پر کرم فرما
کبیر پنتھی	کبیر کو ماننے والے
ملھار	برسات کا راگ
دیس	راگ کا نام
مخفی	چھپا ہوا
جلوہ گُستر	جلوہ دکھاتے ہوئے
غربت	پردیس میں ہونا
دل جو	دل کو بہلانے والا
لبِ جو	ندی کے کنارے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

7.8 کتب برائے مطالعہ

1	دیوانِ حالی	الطاف حسین حالی	اردو اکادمی، دہلی، 1991
2	مقدمۂ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، 1982
3	مطالعۂ حالی	ڈاکٹر وحید قریشی	نقوش پریس، لاہور، پاکستان، 1966
4	حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ، 1959
5	خواجہ الطاف حسین حالی	شہزاد انجم	اردو اکادمی، دہلی، 2007
6	حالی بہ حیثیت شاعر	شجاعت علی سندیلوی	سرفراز پریس، لکھنو، 1960
7	حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خاں	اعلیٰ کتب خانہ، ناظم آباد، کراچی، 1956

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 8 اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری

8.3.1 اکبرالہ آبادی کا تعارف

8.3.2 اکبرالہ آبادی کی شاعری کا فکری وفنی مطالعہ

8.3.3 اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری کے امتیازات

8.3.4 منتخب نظموں کی تشریحات

I جلوۂ دربار دہلی

II مستقبل

8.4 آپ نے کیا سیکھا

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالات کے جوابات

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقف ہوں گے
- اکبرالہ آبادی کے فکروفن سے واقف ہوسکیں گے
- اکبرالہ آبادی کے شاعرانہ امتیازات سے واقف ہوسکیں گے
- اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری سے واقف ہوں گے

- نظم نگار کی حیثیت سے اکبرالہ آبادی کے مقام ومرتبہ سے واقف ہوسکیں گے
- اکبرالہ آبادی کی دو نظموں کی تشریح سمجھ سکیں گے

8.2 تمہید

لسان العصر سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی اردو ادب میں ایک خاص مقام اور مرتبہ رکھتے ہیں۔ اکبر نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور فنکاری کے ذریعے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ہندوستان کی سیاسی ،سماجی ،معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی تصویر دکھانے کا کام انجام دیا ہے۔ان کی بصیرت آنے والی نسلوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔ اکبر نے اس دور میں اپنی بصیرت کے پیش نظر جو باتیں کہیں وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اکبر کو اردو شاعری میں طنز ومزاح کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اکبر نے اپنی شاعری میں طنز ومزاح کی آمیزش سے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔ان کی شاعری میں ہمیں سنجیدہ اور فلسفیانہ موضوعات کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں لیکن طنز ومزاح کا رنگ ہی ان کی پہچان بنا۔ اکبر کے تعلق سے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مشرقی تہذیب کے عاشق اور محبّ وطن تھے ۔وہ اپنی تہذیب کو اپنی پہچان سمجھتے تھے اور جب اپنی نگاہوں کے سامنے اس تہذیب کو پامال ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کا درد شاعری کے ذریعے طنز ومزاح کے رنگ میں لسان العصر بن کر سامنے آیا۔

8.3 اکبرالہ آبادی کی نظم نگاری

8.3.1 اکبرالہ آبادی کا تعارف

اکبرالہ آبادی کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔انھوں نے شاعری میں اکبرتخلص اختیار کیا۔ اکبر کی پیدائش 16 رنومبر 1846 کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں ہوئی ۔والد کا نام سید تفضّل حسین تھا جو ایک صوفی منش انسان تھے ۔اکبر کا بچپن داؤدنگر کے ضلع شاہ آباد میں گذرا اور یہیں ان کی ابتدائی تعلیم کا بھی آغاز ہوا۔1856 میں ان کے والد الہ آباد میں آباد ہوگئے ۔گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اکبر کو بچپن سے ہی سماع اور عزا کی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا۔ابتدا میں ان کے والد جو ریاضی میں ماہر تھے خود ان کو پڑھاتے تھے ۔اکبر بچپن سے ہی ذہین تھے اور انھیں ریاضی سے بہت دلچسپی تھی ۔لہٰذا انھوں نے بچپن میں ہی ریاضی میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی ۔بعدازاں جب اکبر کی عمر دس سال ہوئی تو ان کا داخلہ 1856 میں جمنا مشن اسکول میں کرا دیا گیا لیکن بدقسمتی سے

1857 کا ہنگامہ بپا ہوگیا اور ان کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔عمر کے اسی عرصے میں اکبر نے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی بنیادی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی اکبر نے اپنے حصول علم کے شوق میں کمی نہیں آنے دی اور عمر کے آخری مرحلے تک وہ ذاتی طور پر حصول علم کے لیے کوشاں رہے۔

1857 کے ہنگامے کے بعد اکبر کے گھر کی مالی حالت خراب ہوگئی لہٰذا انھیں تعلیم ترک کر کے تلاش معاش میں جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑی۔ابتدا میں کچھ عارضی ملازمتیں ملیں مثلاً پہلے منصفی کیت گنج الہ آباد میں اقبال دعوے لکھے۔فوجداری عدالت میں پروانہ نویسی کی۔دریائے جمنا پر بن رہے ایسٹ انڈیا ریلوے کے پل میں پتھروں کی پیمائش اور تعداد کی گنتی کے لیے عارضی طور پر مقرر کیے گئے۔بعد ازاں ریلوے میں بطور کلرک بیس روپے ماہوار کی نوکری کی۔چونکہ عدالتوں میں پروانہ نویسی کے دوران انھیں قانون سے دلچسپی ہوگئی تھی۔اکبر نے 1867 میں وکالت کا امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا اور ایک انگریز رونسن کے ماتحت وکالت کا آغاز کیا۔بعد ازاں اکبر 1870 میں چیف جسٹس کے مسل خواں مقرر ہوئے۔1873 میں اکبر نے ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا اور سات برس تک الہ آباد، گونڈہ، گورکھپور اور آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔1880 میں حالات تبدیل ہوگئے انگریزی داں وکلا اور بیرسٹروں کی بہتات کے باعث اردو وکلا نے منصفی کے عہدے قبول کر لیے۔اکبر نے بھی درخواست دی لہٰذا 26/نومبر 1880 میں مرزا پور میں بطور قائم مقام منصف کے طور پر اکبر کی جوڈیشل سروس کے سلسلے کا آغاز ہوا جو مختلف مقامات سے گزرتا ہوا دسمبر 1903 میں عدالت خفیہ کے جج کی حیثیت سے الہ آباد میں قبل از وقت رٹائرمنٹ کے نتیجے کے طور پر ختم ہوا۔1898 میں اکبر کو ان کی قانونی خدمات کے عوض ''خان بہادر'' کا خطاب ملا۔

اکبر نے تین شادیاں کی تھیں۔پہلی شادی چودہ برس کی عمر میں خدیجہ خاتون سے ہوئی۔چونکہ یہ شادی بچپن میں ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی لہٰذا نباہ نہ ہوسکا۔ان سے دو لڑکے ہوئے عبادت حسین اور نذیر حسین۔اکبر کو موسیقی سے دلچسپی تھی اس لیے وہ اکثر کوٹھوں پر جایا کرتے تھے جو اس وقت معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔اسی دوران اکبر کا ایک طوائف بوٹا جان سے انس ہوا اور انھوں نے اس سے نکاح کر لیا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔اکبر کی تیسری شادی ایک معزز خاندان کی لڑکی فاطمہ صغریٰ سے ہوئی۔ان سے ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے۔بیٹی اور چھوٹا بیٹا ہاشم جوانی میں

ہی وفات پا گئے ۔ بڑے بیٹے عشرت حسین زندہ رہے جنھیں اکبر نے تعلیم کے لیے ولایت بھیجا اور بعد میں وہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔اکبر کی وفات 15 فروری 1921 میں الہ آباد میں ہوئی۔

اکبر کی شاعری کی مدت تقریباً 60 برس پر مبنی ہے۔انھوں نے 12-11 سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ان کا کلام ان کے کلیات جو چار حصوں میں منقسم ہے،ایک شعری مجموعہ اور ایک مسدس ''گنج پنہاں'' پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ ان کا کچھ کلام مختلف رسائل ،گلدستوں اور نظموں کے مختلف انتخابات میں بھی ملتا ہے۔اکبر کی کلیات کے دو حصے ان کی زندگی میں بالترتیب 1901 اور 1912 میں شائع ہو چکے تھے اور تیسرا حصہ زیر ترتیب تھا۔کلیات کا تیسرا اور چوتھا حصہ اکبر کی وفات کے بعد 1921 اور 1948 میں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ نثر میں بھی اکبر نے اپنے مضامین اور خطوط کی شکل میں ایک وقیع سرمایہ اردو ادب کو عطا کیا ہے۔اکبر نے لکھنؤ کے ''اودھ پنچ'' میں تواتر کے ساتھ علمی،ادبی،سیاسی،سماجی،فلسفہ اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

8.3.2 اکبر الہ آبادی کی شاعری کا فکر و فنی مطالعہ

اکبر کی شاعری کو محققین و ناقدین نے عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔پہلا دور آغاز شاعری سے لے کر 1866 تک ۔دوسرا دور 1866 سے 1884 تک اور تیسرا دور 1885 سے 1908 تک ۔اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔شاعری میں اکبر کے استاد وحید الدین وحید الہ آبادی تھے۔ان کا سلسلہ بشیر علی بشیر کڑوی سے ہوتے ہوئے آتش اور مصحفی تک پہنچتا ہے۔اکبر کی ابتدائی دور کی شاعری میں وحید الہ آبادی کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔اکبر کی شاعری کا پہلا دور روایتی شاعری کا دور تھا جس میں عشقیہ مضامین کی کثرت نظر آتی ہے۔اس دور میں بھی اکبر اپنے انداز اور لب و لہجے کے اعتبار سے منفرد نظر آتے ہیں۔غزل کی پہچان عشقیہ مضامین ضرور ہیں لیکن اکبر کی شاعری میں حسن و عشق کے معاملات کا وہ ذکر نہیں ملتا ہے جو کلاسیکی شاعری میں نظر آتا ہے مثال کے طور پر اکبر کا محبوب خیالی نہیں ہے بلکہ انسانی اور حقیقی ہے۔اس کی جفا و وفا کا انداز بھی جداگانہ ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

محبت کر کے ان سے پھنس گئے ہیں ہم تو آفت میں
نہ دل قابو میں آتا ہے نہ ان پر زور چلتا ہے

ادھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
ادھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

اس کے علاوہ اسی دور میں ہمیں تصوف اور اخلاق اور سیاسی شعور سے متعلق اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلی پائی
دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

خدا کا گھر بنانا ہے تو لے نقشہ کسی دل کا
یہ دیواروں کی کیا تجویز ہے واعظ یہ چھت کیسی

حباب آسا اٹھایا بحر ہستی میں جو سر اپنا
بنایا بس وہیں موج فنا نے ہم سفر اپنا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن رفتہ رفتہ اکبر کا ذہن پختہ ہوتا گیا اور وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہے تھے۔اس دور میں ادب اور سماج میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کے اثرات اکبر پر بھی پڑے لہٰذا انھوں نے ان تبدیلیوں کو تسلیم کیا اور ساتھ ہی اپنی شاعری کا رخ بھی بدل دیا:

غزل ایسی پڑھو مملو جو ہو اعلیٰ مضامیں سے
کرو اب دوسرے کوچے میں اے اکبر گزر اپنا

اکبر کی شاعری کا دوسرا دور زریں دور کہا جاتا ہے۔اس دور میں ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے پیش نظر اکبر کی شاعری کا رنگ نکھر کر سامنے آیا۔اس دور سے ہی اکبر کی شاعری میں ہمیں طنز ومزاح کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جو شاعری کے آخری دور تک غالب نظر آتا ہے۔1877 میں 'اودھ پنچ' کے اجرا نے اکبر کے اس جذبہ کو بروئے کار لانے کا کام کیا۔اکبر کے عہد میں ہندوستانی تہذیب و معاشرہ بحرانی وتنزلی کے دور سے گزر رہا تھا۔غیر ملکی تہذیب وطن پر حاوی ہوتی جارہی تھی لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش کی۔اس دور میں اکبر کی شاعری کے

موضوعات تھے مغربی تہذیب کے نقائص کی نشاندہی اور اس کے مقلدوں کی تضحیک، غلط طرز فکر ، مذہب سے بیگانگی، عقائد میں تبدیلی، آزادیِ نسواں، تحریک سرسید کی مخالفت اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے برے نتائج سے آگاہ کرنا۔ اس کے لیے سب سے بہترین ذریعہ طنز و مزاح تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہی رنگ اختیار کیا۔

طنز وہ مرکب جذبہ ہے جس میں محبت کا سوز، ناکام خواہشوں کی تلخی، مایوسی اور غم و غصہ، نفرت اور حقارت یا بے انصافی ، بے اعتدالی یا بدنمائی کو دور کرنے کی خواہش یا آرزو ہو۔ مزاح کا سبب وہ احساس ہے جو بے ترتیب یا بے ہنگم، بھونڈے اور غیر متوازن رویے، شخص یا منظر کو دیکھ محسوس ہو اور جس کے سبب مزاح نگار ہنستا ہے اور اپنے ساتھ اس ہنسی میں دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے۔

تبدیلی قدرت کا قانون ہے لیکن ایک وقت کے بعد فطری طور پر چیزوں میں تبدیلی کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ اکبر کا دور بھی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اکبر تبدیلی اور ترقی کے مخالف نہیں تھے وہ اس بدلتی ہوئی تہذیب کے مخالف تھے جو اپنی اصل سے دور لے جاتی ہے اور مذہب سے لاتعلقی کا سبب بنتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ
شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اکبر نے سرسید تحریک کو خاص طور پر اپنے طنز کا نشانا بنایا۔ سرسید چونکہ جدت پسند تھے اور ملک و قوم کو مصلحتاً ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ انگریزی تہذیب کو اختیار کریں اور مہذب قوم کی صف میں شامل ہوں۔ اکبر اس تبدیلی کے مخالف تھے۔ وہ تہذیب و مذہبی عقائد میں تحریف کے قائل نہ تھے۔ ان کو مشرقی تہذیب اور ہندوستانی روایات سے عشق تھا۔ سرسید کی فکر اور ان کے طرز تعلیم کی مخالفت پر مبنی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا چرچا ہے جا بہ جا ترے حال تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا دل میں ذرا اثر نہ رہا لاالہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم صلوٰۃ و زکوٰۃ حج کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر بندہ بنا دیا تجھے حب جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی کم سن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا

مغربی تہذیب کے غلبے اور حاکم وقت کی طرز معاشرت کی تقلید اور مہذب بننے کے ساتھ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کا مسئلہ بھی اٹھا۔ اکبر اس کے شدید مخالف تھے۔ وہ اس تبدیلی کو قوم کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ بے پردگی آج بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اکبر نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے ملک کی عورتیں بے پردہ رہیں تعلیم حاصل کرنے کی دوڑ میں اپنی تہذیب کو طاق پر رکھ دیں اور آزادی سے کلبوں اور پارٹیوں میں جائیں۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک
یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیر نابالغ ہیں وہ
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر کی شاعری فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی شاعری کے فکری پہلو پر مفصل روشنی ڈالنے کے بعد ذیل میں ہم اختصار سے اکبر کی شاعری کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ اکبر کا تعلق چونکہ کلاسیکی

شاعری سے تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اکبر کے سلسلہ شاعری کا نسب مصحفی سے ملتا ہے۔ لہٰذا اکبر نے بھی اس شجرہ کی لاج رکھی اور اپنی شاعری میں فن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

تشبیہ

داغ ہائے سینہ گل ہیں آہ سرد اپنی نسیم
گلشن ہستی میں کیا اچھی ہوا کھاتا ہے دل

رعایت لفظی

رسائی زلف نے پائی قدم تک اب وہ کیوں آئیں
بہانہ خوب ہاتھ آیا کہ پابند سلاسل ہوں

روزمرہ محاورہ

تم نے بیمار محبت کو ابھی کیا دیکھا
جو یہ کہتے ہوئے جاتے ہو دیکھا دیکھا
بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

8.3.3 اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری کے امتیازات

نظم کا بنیادی وصف وحدت ہے۔ یوں تو ہر کلام موزوں کو نظم کہا جاتا ہے لیکن بحیثیت صنف کے نظم اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع سے متعلق ربط و تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔ لہٰذا بنیادی پہچان وحدت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غزل کی ہئیت میں کہے گئے مسلسل و مربوط اشعار بھی نظم کے زمرے میں آتے ہیں۔ اکبر نے اپنی نظموں کے لیے غزل سے لے کر مثنوی ،قطع، رباعی اور معریٰ کی ہئیتیں اور بحور استعمال کی ہیں۔ اکبر کے یہاں ہمیں مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر نظمیں قطع کی ہئیت میں ہیں اس لیے ان پر کوئی عنوان درج نہیں ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات عام طور ان کے کلیات کے مرتبین نے دیے ہیں۔

1865 میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جدید اردو نظم کی جو تحریک شروع ہوئی اکبر بھی اس سے متاثر

نظر آتے ہیں۔ محققین کے مطابق اکبر کی پہلی نظم ''نامہ بنام اودھ'' ہے جو مثنوی کی ہئیت میں ہے۔اس میں اکبر نے فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کیا ہے اور انداز بیان بھی پیچیدہ ہے۔لیکن بعد کی نظموں میں یہ خامی نظر نہیں آتی۔مثلاً تعلیم نسواں، نظم قومی، برق کلیسا، جلوۂ دربار دہلی، برٹش راج، لب ساحل اور موج، دریا کی روانی، دو تتریاں، فرضی لطیفہ، پیر و مرشد نے کہا، وہ ہوا نہ رہی، عشرتی گھر کی محبت کا مزا، ایک بوڑھا نحیف وخستہ زار، گرمیِ میں انور نے یہ اکبر سے کہا، درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے وغیرہ۔ان نظموں کے موضوعات سنجیدہ اور فکر انگیز ہیں ساتھ ہی پیرایۂ بیان بھی شستہ اور عام فہم ہے۔

اکبر کی نظموں میں ہمیں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔مثال کے طور پر 'دریا کی روانی' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ادھر پھولتا اور لچکتا ہوا رخ اس سمت کرتا پھسلتا ہوا
پہاڑوں سے سر کو پٹکتا ہوا چٹانوں میں دامن جھٹکتا ہوا
وہ گاتا ہوا وہ بجاتا ہوا یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا

اس نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کو الفاظ کے استعمال پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔سادہ سے الفاظ کا انتخاب کر کے انھوں نے نہایت ہی دلکش تصویر کشی کی ہے۔اکبر نے معریٰ کی شکل میں بھی نظمیں کہی ہیں۔مثال کے طور پر ان کی نظم ''چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر میں نے اٹھایا اس کو انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا

اکبر کی نظموں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ڈرامائیت ہے۔مکالموں کے ذریعے اکبر ایسی تصویر بناتے ہیں کہ منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔مثال کے طور پر 'لب ساحل اور موج'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دور کوہ لب ساحل سے جو گزری اک موج
کوہ نے اس سے کہا تو نے نہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند
بولی سالک نہیں کرتے کبھی ساکن کو پسند

اکبر کے کلیات میں ہمیں مختصر نظمیں زیادہ ملتی ہیں۔اس کے برعکس اکبر نے طویل نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال ''گاندھی نامہ'' ہے۔اس نظم میں اکبر نے ہئیت کے تجربوں کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔

اکبر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ایسے الفاظ کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے جس سے عام طور پر شعرا پرہیز کرتے ہیں۔انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحیں جس خوبی سے اکبر نے استعمال کی ہیں اس کی مثال کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔مثال کے طور پر مختلف نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب اپنی ہسٹری ہم بھول جائیں گے تو کیا ہوگا؟
خدارا اک نظر اس سین کا کرتے تو نظارہ
مشینیں چل رہی ہیں اور کسی کی کچھ نہیں چلتی
ادھر ہیں بے چھلے کندے ادھر ہے برق وش آرا
بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے

8.3.4 منتخب نظموں کی تشریحات

I جلوۂ دربار دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
پلٹن اور رسالے دیکھے گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے بینڈ بجانے والے دیکھے
خیموں کا اک جنگل دیکھا اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا عزت خواہوں کا دنگل دیکھا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری تیزی تھی ہر جمپ سے جاری
ڈالی میں نارنگی دیکھی محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی دہر کی رنگا رنگی دیکھی
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منھ کو اگرچہ لٹکا دیکھا دل دربار سے اٹکا دیکھا
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم میلوں تک وہ چم چم چم چم
پر تھا پہلوئے مسجد جامع روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع سب کے سب تھے دید کے طامع
سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی

آتش بازی چھٹتی دیکھی لطف کی دولت لٹتی دیکھی
چوکی اک چولکھی دیکھی خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی
ایک کا حصہ من و سلوا ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا میرا حصہ دور کا جلوا
اوج برٹش راج کا دیکھا پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا رخ کرزن مہراج کا دیکھا
پہنچے پھاند کے سات سمندر تخت میں ان کے بیسوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی ان کا چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا آنکھیں میری باقی ان کا
ہم تو ان کے خیر طلب ہیں ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں سب سامان عیش و طرب ہیں
اگزبشن کی شان انوکھی ہرشے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی من بھر سونے کی لاگت سوکھی
جشن عظیم اس سال ہوا ہے شاہی فورٹ میں ہال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے قصۂ ماضی حال ہوا ہے
ہے مشہور کوچہ و برزن ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن
ہال میں چمکیں آکے یکایک زریں تھی پوشاک جھکاجھک
محو تھا ان کا اوج سما تک چرخ پہ زہرا ان کی تھی گاہک

گو رقاصۂ اوج فلک تھی اس میں کہاں وہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی بزم عشرت صبح تلک تھی
کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے کوئی مانے خواہ نہ مانے
سنتے ہیں ہم تو یہ افسانے جس نے دیکھا ہو وہ جانے

تشریح

1911 میں دہلی میں انگریزی سرکار کے زیر اہتمام جو جشن منایا گیا اور جس میں جارج پنجم اور اس کی بیوی نے شرکت کی۔ یہ نظم گویا اسی دربار کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اگر یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نظم کے ذریعے اکبر نے ہمیں اس دور کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی و معاشرتی حالات کی تصویر دکھائی ہے۔ فکر و فن کے اعتبار سے یہ نظم اکبر کے لسان العصر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اپنی فنی مہارت سے اکبر نے انگریزی الفاظ کو اس نظم میں جس طرح پرویا ہے وہ اکبر کا ہی خاصہ ہے۔ یہ نظم مربع کی شکل میں ہے۔ اس کے ہر بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔

اکبر کہتے ہیں کہ سر میں دہلی دیکھنے کا جو جنون طاری تھا اسکے نتیجے میں ہم آخر کار دہلی دیکھنے پہنچ گئے وہاں جو کچھ دیکھا اچھا ہی دیکھا۔ مثلاً جمنا کے کنارے اور صاف ستھرے گھاٹ دیکھے اونچے اونچے ستون اور مکان دیکھے جن میں سے ایک کناٹ پلیس بھی تھا۔ فوج کی ٹکڑیاں اور رسالے دیکھے جن میں گورے بھی تھے اور کالے بھی۔ اور ان کے ہاتھوں میں بھالے اور برچھیاں تھیں ساتھ ہی ان میں کچھ بینڈ بجانے والے بھی تھے۔

چاروں جانب خیمے ہی خیمے تھے گویا خیموں کا ایک جنگل ہو اور ان کے درمیان جشن منایا جا رہا ہو۔ وہاں ایک جیسی صورت والے بھی تھے اور مختلف صورتوں والے بھی اور سبھی گویا عزت و وقار کی خواہش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دست و گریباں ہوں۔ وہاں ہر کیمپ کے سامنے سڑک تھی، ہر پائپ سے پانی نکل رہا تھا۔ لیمپوں سے نور کی کرنیں نکل رہی تھیں اور ہر جست میں ایک رفتار کا عالم تھا۔ شاخوں پر نارنگی تھی تو محفل میں سارنگی بج رہی تھی۔ گو کہ یہ بے میل تھی لیکن اس سے دنیا کی نیرنگی ظاہر ہو رہی تھی۔

وہاں بڑے بڑے لوگ اپنی اصل سے بھٹکے نظر آ رہے تھے لہٰذا ہر جگہ ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ان کی کوئی عزت اور توقیر نہیں تھی جس کے باعث ان کا منھ تو اترا ہوا تھا لیکن اس حالت میں بھی دربار سے دل لگا ہوا تھا۔ ہاتھی جن پر زریں جھولیں پڑی تھیں دھیرے دھیرے اپنی مستانی چال میں چل رہے تھے میلوں تک روشنی ہی روشنی پھیلی تھی۔ جامع مسجد کے پہلو تک لوگوں کا ایک جم غفیر تھا اور ہر جانب روشنی ہی روشنی تھی۔کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا سب کے سب کی نظریں حاکم کے ساعت دیدار کی منتظر تھیں۔

سڑکوں پر آتش بازی ہو رہی تھی۔سب عیش وعشرت کے مزے لے رہے تھے اور لوگوں کی بھیڑ اس قدر تھی کہ سانس لینا محال تھا۔خوب سجی دھجی ایک بہت ہی قیمتی چوکی دیکھی جو گویا چار لاکھ کی ہو۔اس پر تمام طرح کی نعمتیں سجا دی گئی تھیں اور اس کے چاروں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔اس میں سے سب کو ایک جیسی نعمتیں نہیں مل رہی تھیں بلکہ کسی کے حصے میں من وسلوا آیا تو کسی کے حصے میں تھوڑا سا ہی حلوا آیا اور کسی کے حصے میں صرف بھیڑ اور جھگڑا۔یعنی ایسا نظام حکومت ہے کہ سب کو برابر کے حقوق میسر نہیں ہیں جو حاکم ہے اس کے لیے تمام نعمتیں ہیں۔جو ان کے خدمت گذار ہیں ان کے حصے میں تھوڑا ہی آتا ہے اور جو عوام ہے اس کے حصے میں صرف لڑائی، جھگڑا، بھوک اور غریبی آتی ہے۔اسی اثنا میں میں ان سب باتوں سے دور صرف نظارے میں مصروف تھا۔

یہ زمانے کا رنگ ہے کہ کرزن کی قسمت کا ستارہ اتنا بلند تھا کہ اس کو یہاں کی حکومت اور تخت وتاج ملا۔وہ سات سمندر پار کر کے یہاں آیا۔خود تو دانش مند تھا ہی ساتھ ہی جو اس کے ماتحت تھے وہ بھی حکمت ودانش کا مجسمہ تھے اور سب کے اندر سکندر جیسی صفات تھیں۔قسمت کی بلندی ان کی ملاقاتی ہے اور ساتواں آسمان ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔یعنی وہ جو چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں۔سب کچھ ان کے قبضے میں ہے چاہے محفل ہو یا ساقی اور دوسرے صرف ان کا نظارہ کر سکتے ہیں۔گویا انسان کی آنکھوں کے علاوہ اس کا سب کچھ ان کے قبضے میں ہے۔

ملک کے جتنے باشندگان ہیں سب ان کا اچھا چاہتے ہیں پھر بھی ان کی حکومت کا انداز بھی کتنا عمدہ ہے کہ ان کو صرف اپنے عیش وطرب کی پڑی ہے عوام کے مسائل کی انھیں کوئی فکر نہیں ہے۔نمائش کا حال یہ ہے کہ وہاں لگی ہوئی ہر شے عمدہ سے عمدہ اور اچھی سے اچھی ہے۔سب کے اندر اتنا اعتدال ہے کہ ان کی ناپ جوکھ مشہور ریاضی داں اقلیدس کی ہو۔

اس سال کا جشن گذشتہ سالوں کے جشن سے بڑا ہے۔اس جشن میں قلعہ معلیٰ میں بیلی ڈانس (رقص) ہوا جس سے سارا ہال روشن ہو گیا اور جس کی چمک دمک سے لوگ اس قدر نشے میں آ گئے کہ اپنے ماضی کی شان وشوکت اور عظیم روایات کو ماضی کا قصہ سمجھ کر بھول گئے۔گلی کوچوں میں یہ چرچہ ہے کہ لیڈی کرزن نے ایسا بیلی ڈانس (رقص) کیا ہے کہ جس کو دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے تمام عورتیں رشک سے اس رقص کو دیکھ رہی تھیں۔

ہال میں یکا یک زریں پوشاک پہنے برآمد ہوئیں۔پوشاک میں ایسی چمک تھی کہ زہرہ کی چمک بھی اس کے آگے ماند پڑ رہی تھی اور اتنی دلکشی تھی کہ آسمان کی بلندی بھی اس کے نظارے میں محو تھی۔ لیڈی کرزن کو رقص کرتے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ لیڈی کرزن نہیں بلکہ رقاصۂ فلک رقص کر رہی لیکن جو حسن ان کے رقص میں تھا وہ رقاصۂ فلک میں بھی نہ ہوگا۔ان نظاروں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ گویا اندر کی سبھا سجی ہوئی ہو اور یہی عالم صبح تک تھا۔

آخر میں کہتے ہیں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس میں میرے ذہن رسا کا کمال ہے اب اس کو کوئی مانے یا نہ مانے۔لوگ کہنے کو تو بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں لیکن اس کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس نے یہ سب دیکھا ہو۔

II مستقبل

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں ، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی

کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال وسم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے
دب جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں میں ہی دفن افسانۂ جاہ وحشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن ، نہ تم ہوگے ، نہ ہم ہوں گے

تشریح

مندرجہ بالا نظم اکبر کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔اس میں اکبر نے ہمیں مستقبل کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ موجودہ دور میں حرف بہ حرف صادق ثابت ہوئی ہیں۔اس سے ہمیں اکبر کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں نہ صرف اپنے دور تک محدود تھیں بلکہ ان کی بصیرت مستقبل کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ان پر رجعت پسندی کا لزام لگایا جاتا ہے حالانکہ وہ ترقی کے مخالف نہ تھے بلکہ اپنے ملک،تہذیب اور روایات سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔اور یوں وہ قوم جس نے اپنے اسلاف کی روایات کو فراموش کر دیا ہو ترقی کی اصل بلندی پر نہیں پہنچ سکتی۔

اکبر ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اپنی نظروں کے سامنے رخصت ہوتے ہوئے اور غیر ملکی تہذیب کو غالب ہوتے ہوئے دیکھ کر کہتے ہیں کہ مستقبل میں ہماری ہندوستانی تہذیب آہستہ آہستہ رخصت

ہو جائے گی اور اس کی جگہ مغربی تہذیب اور اس کے لوازمات سماج پر غالب آ جائیں گے۔ حسینوں کی زیب و زینت کا انداز بدل جائے گا اور جو یہ بالوں میں پیچ و خم اور چوٹیاں نظر آ رہی ہیں ان کی جگہ کھلے بال ہوں گے۔ عورتیں جو آج پردے میں نظر آ رہی ہیں کل ان کے چہروں سے گھونگھٹ اور حجاب ہٹ جائیں گے۔ زمانے میں طبیعتوں کا انداز بدل جائے گا۔ خوشی اور غم کے اسباب بدل جائیں گے۔ ہندوستان میں جو مغربی تہذیب کی تقلید کی ہوا چل رہی ہے یہ ہندوستانی تہذیب کے گلشن میں نئے گل کھلائے گی۔ تہذیب و تمدن کی تبدیلی کے باعث لوگوں کے مذہبی عقائد میں تیزی سے تبدیلی واقع ہوگی اور مغربی تہذیب کا ایک نیا کعبہ بنے گا جس میں مغربی پتلوں کی پرستش کی جائے گی۔ یعنی سب کا ایمان صرف مغربی تہذیب ہوگا اور موجودہ مشرقی تہذیب فرسودہ قرار دے دی جائے گی۔ لوگ مغرب کی تقلید میں جتنا چاہیں غرق ہو جائیں چونکہ ان کی اصل مشرق ہے لہٰذا ان کے نغمے بے جوڑ ہونے کے باعث سر اور تال سے عاری ہوں گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تقلید تقلید ہوتی ہے وہ اصل میں نہیں بدل سکتی مشرق والے جتنی چاہے مغرب کی پیروی کر لیں وہ مغربی کبھی نہیں بن پائیں گے کیونکہ ان کی اصل مشرق ہے۔ ہر تہذیب کا ایک اپنا انداز اور طور طریقے ہوتے ہیں ہر عمل اور شے کی ایک مخصوص اصطلاح اور نام ہوتا ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ مستقبل میں آنے والی نسل مشرقی اصطلاحوں سے نا آشنا ہوگی مثلاً طشتری، باغ، چارپائی وغیرہ کی جگہ مغربی اصطلاحیں پلیٹ، گارڈن، بیڈ جیسی اصطلاحیں رائج ہو جائیں گی۔ شرافت کو ناپنے کا پیمانہ اور معیار بدل جائے گا لہٰذا جو آج شریف کہلاتے ہیں ممکن ہے کل رذیل ٹھہرا دیے جائیں۔ قوم اپنے بزرگوں کی عظمتوں کو فراموش کر دے گی ان کے جاہ و حشم اور شان و شوکت کا ذکر زبانوں سے ہٹ کر صرف کتابوں تک محدود ہو جائے گا۔ اور کسی کو اس تبدیلی کا نہ احساس ہوگا اور نہ غم ہوگا کیونکہ جس ماحول اور تہذیب میں ان کی پرورش ہوئی ہوگی وہ اس سے نابلد ہوگی۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اے اکبر تم کو اس تبدیلی کا غم اتنا کیوں ہے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب نہ یہ تہذیب ہوگی اور نہ ہی تم ہو گے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا

- اکبر کے سوانحی کوائف کا علم ہوا۔
- اکبر کی شاعری کے فکری و فنی پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- اکبر کی فکری و فنی صلاحیتوں کا علم ہوا۔
- اکبر کی نظم نگاری کے امتیازات معلوم ہوئے۔

- اردو شاعری میں اکبر کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوا۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1 اکبر کا سنہ ولادت اور وفات کیا ہے؟
2 اکبر کی شاعری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟
3 اکبر کی تین نظموں کے نام لکھیے ؟
4 اکبر نے نظموں کے لیے کون کون سی ہئیتیں استعمال کی ہیں؟
5 اکبر کی شاعرانہ خصوصیات مختصراً بیان کیجیے؟

8.6 سوالات کے جوابات

1 پیدائش 16 نومبر 1846 اور وفات 15 فروری 1921۔
2 اکبر کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور آغاز شاعری سے لے کر 1866 تک۔ دوسرا دور 1866 سے 1884 تک اور تیسرا دور 1885 سے 1908 تک۔
3 ا۔ برق کلیسا ۲۔ برٹش راج ۳۔ لب ساحل اور موج
4 اکبر نے اپنی نظموں میں غزل، مثنوی، قطع، رباعی اور معریٰ وغیرہ کی ہئیتیں استعمال کی ہیں۔
5 اکبر کی شاعری اپنے عہد کی آواز ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرنے کا درس دیا۔ اکبر نے اپنی بصیرت سے جو باتیں کہیں وہ آج کے دور میں صادق آتی ہیں۔ فنی اعتبار سے اکبر کی شاعری میں ہمیں الفاظ کے انتخاب ان کے بہترین استعمال کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندوستانی کے ساتھ ساتھ انھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی کے الفاظ کا استعمال نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف پیچیدگی اور مشکل ہے وہیں دوسری جانب سلاست و روانی بھی ہے۔

8.7 فرہنگ

لفظ	معنی
جز	حصہ
آغاز	ابتدا
محاکات آفرینی	لفظوں سے تصویر بنانا
مستحکم	مضبوط

قدیم	پرانا
منظوم	نظم کیا ہوا
عروج	ترقی
جزئیات	تفصیل
ہئیت	ڈھانچہ
وقیع	قیمتی
بہم	ساتھ ساتھ
سکوت	خاموشی
لاٹ	ستون

8.8 کتب برائے مطالعہ

1 اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ — صغریٰ مہدی — مکتبہ جامیہ ملیہ، نئی دہلی-، 1981

2 اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003

3 اکبرالہ آبای: ایک سماجی و سیاسی مطالعہ — ڈاکٹر افصح ظفر — اقدار کتاب گھر، کلکتہ، 1977

4 اکبرالہ آبای اوران کا کلام — نورالرحمٰن — مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، 1964

5 اکبرنامہ — عبدالماجد دریابادی — ادارۂ فروغ اردو، لکھنو، 1954

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY